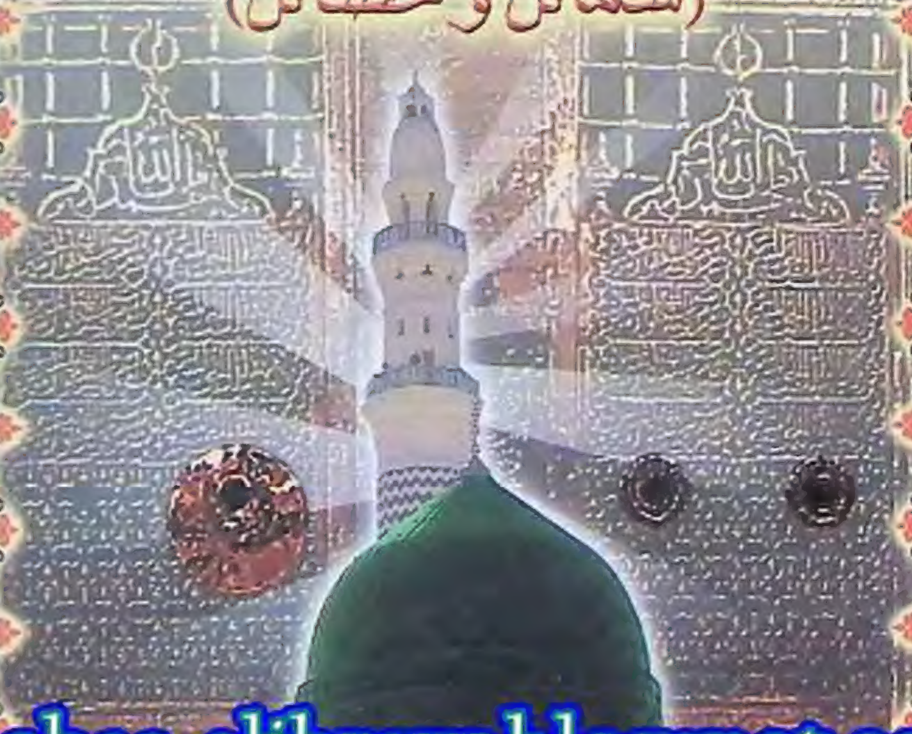
آفتابِ نبوت کی چند کرنیں ﷺ

(شمائل و خصائل)



مولانا عبداللہ عباس ندوی
معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳۰ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

آفتابِ نبوت ﷺ کی چند کرنیں

(شمائل و خصائل)

مولانا عبداللہ عباس ندوی

معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱، کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب ـــــــ آفتاب نبوتؐ کی چند کرنیں
تصنیف ـــــــ مولانا عبداللہ عباس ندوی
طباعت ـــــــ القادر پرنٹنگ پریس
اشاعت ـــــــ ۲۰۰۲ء
ضخامت ـــــــ ۱۲۰ صفحات
کمپوزنگ ـــــــ ولی حسن ندوی، مدینہ منورہ
ٹیلیفون ـــــــ ۶۶۰۰۸۹۶

اسٹاکسٹ :

مکتبۂ ندوہ، قاسم سینٹر۔ اُردو بازار، کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۷۴۶۰۰

مولانا عبد اللہ عباس ندوی

آفتابِ نبوت کی چند کرنیں

شمائل و خصائل

حضور رسولِ کریم ﷺ کا حلیہ و سراپا، عادات و
معمولات اور مکارمِ اخلاق کی چند جھلکیاں،
جو صحاح و سنن کی معتبر ترین کتابوں
سے انتخاب کر کے اردو میں
جمع کی گئیں ہیں۔

شائع کردہ

تعارفِ مؤلف

عبد اللہ عباس ندوی

فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پوسٹ گریجویٹ ''اَلسنۂ ساميات'' (ممتاز)

ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (فلسفۂ لسانیات) یونیورسٹی آف لیڈس، انگلینڈ

جائے پیدائش: پھلواری شریف، پٹنہ ۱۹۲۶ عیسوی

موجودہ سکونت وشہریت: مکہ مکرمہ

مؤلفات:

۱: دروس الأطفال

۲: آسان فقہ

۳: عربی کی نعتیہ شاعری

۴: ردائے رحمت (شرح قصیدہ ''بانت سعاد'' اور قصیدہ ''بردہ'')

۵: تفہیم المنطق (اردو)

۶: پیغمبر اخلاق وانسانیت (خطباتِ حیدر آباد)

۷: تعلم لغة القرآن الکریم (عربی، انگریزی)

۸ : قاموس ألفاظ القرآن الكريم (عربی، انگریزی)

۹ : ترجمات معاني القرآن الكريم و تطور فهمه عند الغرب (عربی)

۱۰ : نظام اللغة العربية (عربی)

۱۱ : مذاهب المنحرفين في التفسير (عربی)

۱۲ : نگارشات

۱۳ : "میں بھی حاضر تھا وہاں ..." پر مفصل تبصرہ

۱۴ : مصائب کا درماں (شرحِ قصیدہ علامہ نحوی)

۱۵ : میرِ کارواں

سابقہ مشغولیات :

استاذِ ادب، ادیب اول دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

وکیل ادارہ نشریاتِ شرقیہ (سعودی عرب)

مدیر منظمات اسلامیہ و اقلیات، رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)

اڈیٹر ماہنامہ رابطہ (انگریزی)

استاذ جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ (ادبِ عربی و معہدِ عربی برائے غیر عرب)

موجودہ مشغولیات :

معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مشیرِ اعزازی رابطہ عالم اسلامی، (مکہ مکرمہ)

ممبر آف لنگوئسٹک سوسائٹی کیمبرج (انگلینڈ)

ہدیہ

میں اپنی اس کتاب کو صدیقِ محترم

حمد و نعت کے شاعر و ادیب، فاضل و دانشور

أبو الامتیاز ع س مسلمؔ

کی خدمت میں ھدیہ کرتا ھوں۔

تقبل الله منا و منه صالح الأعمال

فہرست عناوین

ابتدائیہ

حضرت رسول کریم ﷺ کے حلیہ و سراپا، اخلاق وعادات کا ایک ایک نقش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ بیان کردیا ہے، ان کے بیان میں کوئی مبالغہ یا زیادتی و کمی نہیں ہے، کہیں مختصر اور کہیں مفصل، صحاح و سنن، مسانید ومؤطات اور ان سے منقول مجموعاتِ احادیث میں صحابہؓ کرام کے چشم دید اور صداقت و راست گفتاری سے بیان کئے ہوئے صفاتِ رسول اللہ ﷺ منقول ہیں، ان کتابوں میں امام محمد بن عیسی الترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الشمائل المحمدیۃ'' کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی جمع کردہ احادیث میں ایک مستقل حصہ آنحضرت ﷺ کے حلیہ و سراپا، اخلاقِ عالیہ، عادات و معمولات سے متعلق کے لئے خاص کردیا

ہے اور یہ شمائلِ ترمذی کے نام سے مشہور ہے، یعنی حضوراکرم ﷺ کے شمائل وخصائل جن کو امام ترمذیؒ نے مرتب کیا ہے، اس مجموعہ کی بے شمار شرحیں عربی میں لکھی گئی ہیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کی شرحیں اور ترجمے ہوئے ہیں، ان ترجمہ کرنے والوں میں بہت سے برگزیدہ مشائخ، محدثین اور اہل اللہ رہے ہیں، جنہوں نے اپنے جذبہء عقیدت کے ساتھ اپنے علاقہ کی زبان میں اور اپنے ذوق و وارفتگی کے اسلوب میں ان احادیث کو نظم یا نثر میں بیان کیا ہے۔

امام ترمذیؒ نے حلیہ اور سراپا کے بیانات حضرت انس بن مالک، حضرت براء بن عازب، ھند بن ابی ھالہ، حسین بن علی رضی اللہ عنہم سے روایت کئے ہیں، ھند بن ابی ھالہ سے سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں اور تمام محدثین نے اسی طرح ان احادیث کو نقل کیا ہے کہ حسن بن علی اپنے ماموں ھند بن ابی ھالہ سے روایت کرتے ہیں ، کیوں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی ہے اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ صرف سات سال کے تھے اور اگرچہ وہ خود آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھے مگر حضرت ھند بن ابی ھالہ کی طرح حلیہٗ مبارک کا ایک ایک نقش ان کے ذہن میں نہیں تھا، حضرت ھندؓ بن ابی ھالہ جن کو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اپنا ماموں فرماتے ہیں وہ حضرت ام المؤمنین خدیجہ رضی

اللہ عنہا کے پہلے شوہر ابو ھالہ کے صاحبزادے تھے۔

حضرت سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کو امام بیہقی نے اپنی کتاب "الدلائل" میں حاکم سے روایت کیا ہے، ابنِ کثیر نے "البداية والنهاية" میں اسی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، طبرانی، رویانی اور ابنِ عساکر نے اسی حوالہ سے روایتیں کی ہیں جو "کنز العمال" (۲۲/۴) اور البغوی نے "الإصابة" (۱۱/۳) میں نقل کی ہے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک، براء بن عازب، عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہم سے بھی روایتیں کی ہیں جنہیں ہم شمائلِ ترمذی کی روایت کے بعد نقل کریں گے۔

مناسب ہوگا اردو خواں حضرات کے لئے ایک لفظ کی تشریح شروع میں کردی جائے، کیوں کہ امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ نے اسے باب کا سرنامہ (عنوان) بنایا ہے۔

لفظ "خَلق" کے معنی ہیں: حلیہ و سراپا اور "خُلُق" کے معنی ہیں اخلاقِ عالیہ، عادات و معمولات، جیسے آپ کسی صاحب کے بارے میں کہیں کہ ان کا چہرہ کتابی، پیشانی چوڑی، ناک بلند ہے، اس کو "خَلق" کہا جائے گا، اور اگر کہیں: بہت سخی ہیں، ملنسار ہیں، مصیبت زدوں کے غم گسار ہیں، (وغیرہ وغیرہ) ان کو "خُلُق" کہا جائے گا، اور لفظ "شمائل" میں دونوں مفہوم داخل ہیں، یہ لفظ جمع ہے، اس

کا مفرد ''شِمال'' ہے، یعنی خصلت و عادات، قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ''وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ''۔

راقم نے ان اوراق کے مجموعہ کا نام ''شمائل و خصائل'' رکھا ہے، شمائل لفظ تو درست ہے مگر خصائل کا لفظ اردو کے لحاظ سے صحیح مگر عربی کے لحاظ سے محلِ نظر ہے، خصلت کی جمع عربی میں خصال ہے نہ کہ خصائل، خصائل ''خصيلة'' کی جمع ہے، ران اور بازو کے پُرگوشت حصہ کو کہتے ہیں، مگر غالباً قافیہ کی موزونیت کی وجہ سے محمدؒ البکری الدمشقی نے شمائل کی شرح کا نام ''الخصائل الأحمدية'' رکھا ہے، نیز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی شرح کا نام یہی رکھا ہے، ان بزرگوں کی اتباع اور اردو میں قافیہ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے راقم نے بھی اسی لفظ کو باقی رکھا ہے۔

ترتیبِ کتاب میں ایک مسئلہ قابلِ غور تھا کہ آیا احادیث کے نصوص عربی میں نقل کئے جائیں اور ان کے الفاظ و تراکیب کی شرح عربی یا اردو میں کرنے کے بعد ترجمہ دیا جائے یا صرف اردو شرح دے دی جائے اور جو اہلِ علم اصل متون (نصوص) کو دیکھنا چاہیں ان کے لئے مفصل حوالے دے دیئے جائیں، میرے ایک عزیز نے کہا: جو لوگ عربی میں مطالعہ کرسکتے ہیں وہ براہِ راست پڑھ سکتے ہیں، آپ یہ کتاب اردو خواں بھائیوں کے لئے لکھ رہے ہیں، ان کے سامنے

نصوص ہوں یا نہ ہوں دونوں برابر ہے، بات صحیح ہے مگر بزرگانِ سلف کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ قرآنِ کریم اور اکثر احادیث کی شرح و ترجمانی کرتے وقت نصوص کو نقل کر دیتے ہیں تاکہ اپنے الفاظ قرآن و احادیث کے الفاظ سے کمی یا زیادتی کا سبب نہ بن جائیں، اس لئے اصل نصوص کو باقی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا، مگر حسبِ ضرورت کہیں ایک کالم میں عربی، دوسرے کالم میں اردو ترجمہ، اور کہیں عربی متن ایک جگہ تسلسل کے ساتھ نقل کرنے کے بعد ترجمہ کی عبارت کتابی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔

یہ ناچیز اس اصول کا قائل ہے کہ مؤلف سب سے پہلے موضوع کی وضاحت کر دے جو سطورِ بالا میں عرض کی جاچکی، دوسری بات یہ کہ یہ کتاب مختصر یا مفصل جو بھی ہو کس کے لئے لکھی گئی ہے؟ اس سے کون لوگ مستفید ہوں گے ؟ اور تالیف کی غرض و غایت کیا ہے؟ اور آخری سوال کہ ترتیب کا کیا اسلوب وانداز طے کیا گیا ہے؟ اس آخری سوال کا جواب بھی اوپر ذکر کر دیا گیا، اب رہا "کیوں؟" کا جواب یعنی کس کے لئے اور مقصدِ تالیف کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے:

راقم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس زمانے میں جو لوگ عصرِ جدید کے افکار کے داعی ہیں ان کا خیال ہے کہ حضرت رسولِ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں زندگی کا لائحہ عمل تلاش کرنا چاہئے، نظریۂ حیات کیا

ہو؟ سیاسی اور اقتصادی مسائل کا حل سیرتِ نبویہ میں کہاں ملتا ہے؟ مسلمانوں کی دفاعی طاقت کس طرح بڑھائی جائے؟ آیتِ کریمہ:

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ عَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ...﴾ (إلى آخر الآية)

[الأنفال:٦٠]

اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہوسکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو، اور اس کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جوکہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔

پر عمل اس زمانے میں کس طرح کیا جائے؟ اور اسی طرح فوجی، دفاعی، سیاسی اور اجتماعی مسائل میں سنتِ نبوی سے رہنمائی کیسے حاصل کی جائے؟ میلاد کی مجلسوں، معجزات کے قصے آپؐ کے زلف وگیسو کی تفصیل سن کر ہم کیا کریں گے؟ ان سے مسلمانوں کا کون سا مسئلہ حل ہوگا؟ یہ تو عوام کو حقیقت سے دور کرنے، جہاد کی اسپرٹ سے محروم کرکے ان کو درگاہوں اور خانقاہوں سے وابستہ کرنے کی سازش ہے۔

یہ بات موجودہ عصر میں سوچنے کا طریقہ ضرور ہے اور بے سر وپا یا غلط بھی نہیں ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے، آج جو مسلمان دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اسلامی تعلیمات پر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں وہ ''نظریہٗ حیات'' کی بناء پر نہیں، بلکہ اُن کی طاقت کا مرکز رسول اللہ ﷺ سے ذاتی محبت اور قلبی لگاؤ ہے، اُن کے افکار کی تعمیر اس طرح نہیں ہوئی کہ پہلے نظریہ اور اصل کو مانتے، پھر اُس نظریہ اور فکر کا جو مذہب ہوتا اُس کو قبول کرتے، پھر آخر میں دیکھتے کہ اس نظریہ سے کس نے روشناس کرایا، اس سے ''واجبی عقیدت'' رکھتے، اسلام کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا فکری سفر آنحضرت ﷺ سے عشق و وابستگی سے شروع ہوا، قرآن کریم پر ایمان آپؐ کی محبت نے دیا، آخرت کا خوف آپؐ ہی کے ''نذیر مبین'' ہونے نے عطا کیا۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پہلے ایمان لانے والے پختہ عمر شخصیت کے مالک تھے، آپؓ نے ایمان لانے کے لئے کوئی سوگند یا گواہ طلب نہیں کیا، معجزہ یا خرقِ عادت کے منتظر نہیں رہے، صرف آپؐ کی سیرت، آپؐ کا صادق و امین ہونا اور زندگی بھر کی پاکبازی اور رفاقت نے آپ کو ایمان لانے پر مائل کیا اور ایسا ایمان جس کی کوئی نظیر نہیں، غارِ ثور میں ایک زہریلا سانپ ڈس لیتا ہے مگر منہ سے آواز نہیں نکالتے کہ کہیں نبی کریم ﷺ کو ایذا نہ پہنچے، اس سفر میں آپؐ کے ساتھ رہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا آپؐ کا کوئی

یار و مددگار نہیں تھا اور کفارِ قریش سو سرخ اونٹ دینے کا اعلان کر چکے تھے کہ جو شخص آپؐ کو زندہ یا مردہ لے آئے گا اس کو یہ انعام دیا جائے گا، جو اس وقت کے لحاظ سے عربوں کی معیشت کو دیکھتے ہوئے بہت بڑی دولت تھی، سراقہ بن جعشم کا پیچھا کرنا اسی سفر کا واقعہ ہے جس میں رفیقِ کار، رفیقِ ہجرت اور رفیقِ زندگی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ آپؐ کے ہمرکاب تھے، محبت کے علاوہ کون سا جذبہ ہو سکتا ہے جو ان نازک مواقع پر آنحضرت ﷺ کا ساتھ دینے پر مجبور کرتا۔

اسی طرح غزوۂ احد کے موقعہ پر حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے لئے اپنے جسم کو سپر بنا دینا کہ کوئی تیر آپؐ کو گزند نہ پہنچائے کس جذبہ کے تحت تھا؟

اور اسی طرح ان صحابیہؓ کا حال یاد کیجئے جن کے شوہر، بھائی، باپ، بیٹے سب غزوۂ احد میں شہید ہو چکے تھے اور وہ میدانِ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کو پوچھتی ہوئی آئیں، کسی نے بتایا یہ لاش تمہارے شوہر کی ہے، آگے بڑھیں تو اشارہ کیا گیا یہ لاش تمہارے بیٹے کی ہے اور وہ یوچھتی جاتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ جب آنحضرت ﷺ پر نظر پڑی اور آپؐ کو زندہ وسلامت دیکھا تو فدائیت اور جاں سپاری، عقیدت ومحبت کی دنیا کا نایاب اور ناقابلِ فراموش جملہ ان خاتون کی زبان سے نکلا: ”کل هَمٍّ بعدك یا رسول اللہ جلل“

یعنی آپ کے بعد یا رسول اللہ ہر مصیبت ہلکی ہے، کوئی بتائے کہ محبت کا یہ جوش اللہ کا عطیہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ دنیا کے کسی نظریہ میں اور تاریخ کے کسی دور میں فدائیت اور فنائیت کا ایسا نمونہ ملتا ہے؟

آج مسلمان ہزار گئے گزرے ہیں لیکن حضورؐ کے نامِ نامی پر ان کو پکارا جائے اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی ناموس کا حوالہ دیا جائے تو ان کے اندر سوکھی رگوں میں ابلتا ہوا گرم خون دوڑنے لگتا ہے اور وہ جان، مال، عزت، آبرو، آل اولاد سب کو قربان کر کے اور آپس کے تمام اختلافات کو بھول کر جہاد کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

اس محبت کا سرچشمہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جس پر کروڑہا کروڑ انسان ڈیڑھ ہزار برس کے عرصہ میں جان قربان کر چکے ہیں، صلیبیوں کے حملے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ بیت المقدس کی گلیوں میں اونٹ کے ٹخنوں تک مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا، اس محبت کو زندہ رکھنے کے لئے آنحضرت ﷺ کا ذکر، آپؐ کی سیرت کا بیان اور آپؐ کی ایک ایک ادا کو دل و دماغ میں پیوست کرنا مسلمانوں کا شعار رہا ہے، اسی شمائل میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اپنے ماموں ھند بن ابی ھالہ سے فرماتے ہیں کہ ذرا اچھے طریقے سے آپؐ کا حلیہ اور سراپا بتایئے تاکہ مَیں اس کو دل و دماغ میں اتار لوں، عربی کا لفظ ہے: ''أَتَعَلَّقُ بِهٖ'' یہ تمنا وراثۃً ہر مسلمان کو ملی ہے اور

آئندہ نسلیں بھی ان سے کسبِ فیض کرتی رہیں گی۔ محدثینِ کرام نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ایک ایک تفصیل بیان کی ہے اور ہر زمانے میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق محبت اور عشق کی زبان میں لوگوں نے ان کو بیان کیا ہے۔

ان چند سطروں کو مرتب کرنے اور نئے ترجمے کی ضرورت وہی ہے جو اس عاجز نے "عربی کی نعتیہ شاعری" کے ابتدائیہ میں ذکر کیا ہے کہ اس ناکارہ زندگی کے چند لمحات آپؐ کی یاد میں بسر ہو جائیں اور وابستگانِ دامنِ نبوت کے پائیں میں بلکہ صفِ نعلین میں حاضری کا ایک ذریعہ مل جائے، خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر یہاں بھی ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ دہراتا ہوں۔

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے "اُسی" کاکل کے گرفتار رہو (۱)

عبد اللہ عباس ندوی
جدہ، مدرسۃ الواحۃ العالمیہ
مکان ضیاء عبد اللہ ندوی
۲۰/ذی القعدہ ۱۴۲۲ھ

---

(۱) خواجہ میر دردؔ کے اصل شعر میں ہے: "الجھے سلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو"

کان خُلُقُهُ القرآن

مقامِ رسالت کا ادراک انسان کے بس سے باہر ہے، ممدوحِ خدا کی مداحی ہماری ہمت سے فزوں اور فکر سے بلند ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سچ فرمایا کہ قرآن کریم آپؐ کے اخلاقِ حمیدہ کا نام ہے، یا یوں کہئے کہ آپؐ کے اخلاقِ حمیدہ کی جستجو صرف آیاتِ کریمہ میں کی جا سکتی ہے، ایک سو سے زیادہ آیات ایسی وارد ہوئی ہیں جن کا تعلق براہِ راست نبی کریم ﷺ سے ہے، ان میں سے چند آیات برکت و سعادت سمجھ کر ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے آنحضور ﷺ کی عظمت ہمارے دل و دماغ میں جانشیں ہو سکتی ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴾

[الفرقان : ٥٦]

اور ہم نے آپؐ کو صرف اس لئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

[سبأ: ۲۸]

اور ہم نے تو آپؐ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بناکر بھیجا ہے، (ایمان لانے والے پر ان کو ہماری رضا و ثواب کی) خوشخبری سنانے والا اور (ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب و عذاب سے) ڈرانے والا، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ﴾

[الأنبياء: ۱۰۷]

اور ہم نے (ایسے مضامینِ نافعہ دے کر) اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لئے۔

﴿ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴾

[النحل: ۸۹]

اور جس دن ہم ہر ہر امت میں ایک ایک گواہ جو ان ہی میں ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم کردیں گے اور اُن کے مقابلے میں آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے آپؐ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام (دین کی) باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی

ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا وَّمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

[البقرة : ۱۴۳]

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو، اور تمہارے رسول اللہ ﷺ گواہ ہوں، اور جس سمت قبلہ پر آپؐ رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اسلئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے، اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل، (ہاں) مگر جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع (اور ناقص) کردیں، (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر

بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾ [آلعمران:۱۶۴]

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا، جب کہ ان میں ان ہی کے جنس سے ایک ایسا پیغمبر بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کے دل کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے غلطی میں تھے۔

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْ عَلَيْكُمْ أٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾

[البقرة: ۱۵۱ - ۱۵۲]

جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا جو تم ہی میں سے، ہیں ہماری آیات (و احکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں (اور جہالت سے) تمھیں دور کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی پس (ان

نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکرگزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

﴿لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

[التوبة : ۱۲۸]

(اے لوگو،) تمہارے پاس ایک پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے، بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

نور است، ہمہ نور سراپائے محمد (۱)

قرآن کریم کی چند آیات کے بعد احادیثِ نبویہ سے ہم آپؐ کے سراپائے مبارک نقل کرتے ہیں، آپ کے حلیہ مبارکہ اور سراپائے اقدس کو جن صحابہ کرام یا آپؐ کے افرادِ خاندان نے بیان کیا ہے، ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، صرف بیان کرنے کے طریقہ (تعبیر) میں کہیں کہیں فرق نظر آتا ہے، یا کہیں ایک صفت کے لئے متعدد الفاظ آئے ہیں، ان میں سے ایک لفظ کسی نے پسند کیا ہے، دوسرے راوی نے دوسرا لفظ۔

مثلاً آپؐ کے موئے مبارک کے متعلق حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپؐ کہ موئے مبارک نہ تو گھنگریالے تھے اور نہ بالکل کھڑے، آپؐ کے گیسو گوشِ مبارک کی لو تک بڑھے ہوئے تھے۔

(۱) عنوان اس شعر سے ماخوذ ہے: عالم چہ شود ہمسر وہمتائے محمد ☆ نور است، ہمہ نور سراپائے محمد
(حضرت فرد پھلواروی م: ۱۲۶۵ھ)

اس مفہوم کو حضرت البراء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمایا : آپؐ میانہ قد کے تھے، دونوں شانوں کے درمیان فاصلہ تھا، آپؐ کے گیسو کان کے لو کو چھو رہے تھے، حلیہ مبارک کے ساتھ شمائل (خُلق) یعنی اخلاقِ حمیدہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، لہذا کوشش کی گئی ہے کہ" پہلے حلیہ مبارکہ کی ایک مفصل حدیث نقل کردی جائے ، پھر آپؐ کی رفتار، گفتار، مجلس، گھر سے نکلنے اور باہر سے گھر آنے کے معمولات اور قوموں کی حاجت روائی میں آپ کے معمولات کا ذکر کردیا جائے، اس طرح پہلے حدیث شریف کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں اس کے بعد اس کے مفہوم کی تشریح کی گئی ہے۔

باب فى خَلُق النبى ﷺ

أخرج يعقوب بن سفيان الفسوى الحافظ، عن الحسن بن على رضى الله عنهما قال سألت خالي هند بن أبي هالة - و كان وصافًا - عن حلية رسول الله ﷺ و أنا أشتهي أن يصف لي شيئا أتعلق به فقال :

صفته ﷺ

كان رسولُ الله ﷺ فَخْمًا مُفَخَّمًا يتلألأ وجهُه تلألُؤَ القمرِ لَيلَةَ البَدْرِ، أطولَ من المَرْبوعِ، وأقصَرَ من المشذَّبِ، عظيمَ الهامةِ، رجُل الشَّعْر، إذاتفرقت عقيصته فَرَق، وإلا فَلا يجاوز شعرُه شحمةَأذنيه إذا وفَّرَه، أزهرَ اللونِ، واسعَ الجبينِ، أزجَّ الحواجبِ، سوابغ في قرَن، بينهما عِرقٌ يدرُّه الغضبُ، أقنى العرنينِ له نورٌ يعلوه، يحسبه من لم يتأمله أشمّ، كثّ اللحية،

أدعج، سهْلَ الخدّينِ، ضليعَ الفمِ، أشنب، مفَلَّجَ الأسنان، دقيقَ المسربة، كأن عنقه جيد دمية في صفاء الفضةِ، معتدل الخلْقِ، بدنا متماسكا، سواءَ البطنِ و الصدرِ،عريض الصدر، بعيد ما بين المنكبينِ، ضخم الكراديس، أنورَ المتجرد، موصولَ ما بين اللُّبَّةِ و السُّرَّةِ بشَعْرٍ يجْري كا لخطِّ، عاري الثديينِ ولابطنِ مما سوى ذلك، أشعرَ الذراعينِ والمنكبين و أعالي الصدرِ،طويلَ الزندينِ رحْبَ الراحةِ،سبْطَ القصْبِ، شثْنَ الكفينِ والقدمينِ، سائلَ الأطرافِ، خُمصانِ الأخْمَصَينِ، مسيح القدمينِ ينبو عنهما الماءُ.

حضرت یعقوب بن سفیان الفسوی الحافظ، حضرت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ھند بن ابی ہالہ (جو کہ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ اور سراپا بیان کرنے میں کافی مہارت رکھتے تھے، اُن کا لقب عربی کا لفظ "وصّاف" ہے) سے خواہش کی کہ مجھے آنحضرت ﷺ کا حلیہ اس طرح بتائیں کہ میرے دل و دماغ میں پورا نقشہ قائم ہو جائے، حضرت ھندؓ بن ابی ہالہ نے فرمایا :

حلیہ مبارکہ

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت بہت پُر جلال اور پُر عظمت واقع

ہوئی تھی، آپؐ کا چہرۂ مبارک اس طرح دمکتا تھا جس طرح چودھویں رات کا چاند دمکے، آپؐ کا قد متوسط درجہ سے کچھ نکلتا ہوا اور لانبے پن سے کچھ دبتا ہوا تھا۔ سر کے موئے مبارک نہ گھنگریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے، (درمیانی قسم کے تھے)، جب کنگھی کرتے اور بال کو سمیٹ لینا چاہتے تو سمٹ جاتے، گیسوئے مبارک کانوں کی لو سے کبھی آگے نہیں بڑھے، رنگ کھلتا ہوا، شاداب اور گورا تھا جس میں سرخی دمکتی تھی، پیشانی اونچی اور چوڑی تھی، دونوں آنکھوں کے درمیان ایک مناسب فاصلہ تھا جس پر ایک ابھری سی رگ تھی، جب کوئی بات ناگوار گزرتی تو یہ رگ اور ابھر جاتی، ناک کا بانسہ لانبا اور نازک تھا، پُرگوشت اور بھدًا نہیں تھا۔

آپؐ کا سراپا ایک نورِ مجسم تھا، جس نے قریب جاکر اور غور سے نہیں دیکھا تھا وہ محسوس کرتا تھا بینیِٔ مبارک (ناک کا بانسہ) بہت زیادہ لانبا ہے، ریشِ مبارک (داڑھی) کے بال گھنے تھے، آنکھوں کا دیدہ سیاہ تھا، رخسار نرم، منھ کا دہانہ کشادہ اور دانت ایک دوسرے سے مجڑے ہوئے تھے، (ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ جب مسکراتے تو دندانِ مبارک کا حسن نظر آتا) گردن ایسی لگتی تھی جیسے موم یا سنگِ مرمر کی ڈھلی ہوئی ہو، سینے سے ناف تک بالوں کی ایک لکیر تھی، اس کے علاوہ اطرافِ سینہ اور پیٹ پر بالوں کے گچھے نہیں

تھے، جن حصوں پر بال نہیں تھے وہ دیدہ زیب اور روشن معلوم ہوتے جیسے چاندی چمک رہی ہو، پنڈلیوں اور شانوں پر گھنے بال تھے، سینہ چوڑا، گہرا اور وسیع تھا، ہتھیلی پُر گوشت، کفِ دست کشادہ تھے، دونوں پیر اعتدال کے ساتھ لانبے تھے، تلوے اور پنجوں کے درمیان کا حصہ اتنا گہرا تھا کہ اگر معمولی پانی پڑ جائے تو نیچے سے بہہ جائے۔

مشيه ﷺ

إذا زال زالَ قَلْعًا، يخطُو تَكَفُّئوًا، و يمشي هَوْنًا، ذَرِيع المِشْيَهِ، مسيحَ القدمينِ، إذا مشى كأنما ينحطّ من صَببٍ، و إذا التَفَتَ اَلْتَفَتَ جميعًا، خفضَ الطَّرْفِ، نظره إلى الأرضِ أطولُ من نظره إلى السماءِ، جُلّ نظره المُلاحظه، يسوق أصحابه، و يبدأ من لقيه بالسلام۔

آپؐ کی رفتار

آپؐ چلتے تو پورا پاؤں اٹھاتے (ایسا نہیں جیسے بعض متکبر چلتے وقت زمین پر پاؤں گھسیٹے ہوئے چلتے ہیں) اور آگے رکھتے، آپ سبک رفتار تھے، (جیسا کہ قرآن کریم میں اہلِ ایمان کی صفت بتائی گئی ہے: ﴿ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْأَرْضِ هَوْنًا ﴾ اور تیز تیز قدم بڑھاتے، (ایک روایت میں ہے کہ بعض صحابہؓ جو آپؐ کے

ساتھ چلتے وہ تیز قدمی میں آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکتے اور پیچھے رہ جاتے، [کنز العمال]) آپؐ چلتے تو ایسا لگتا جیسے اوپر سے نیچے کی طرف اتر رہے ہیں، جب (راستے میں) کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح اس کی طرف رخ کرکے اس کی بات سنتے مگر نگاہیں نیچی رہتیں، آپؐ کی نگاہ آسمان کے بجائے زمین کی طرف زیادہ رہتی، کسی شخص پر نظر ڈالتے تو ایک جھلک دیکھنے پر اکتفاء فرماتے، آپؐ کے ساتھ صحابہؓ کرام ہوتے تو ان کو آگے رکھتے خود ان کے پیچھے چلتے، کوئی ملتا تو سلام کرنے میں پیش قدمی فرماتے۔

أسلوبُ بيانه ﷺ

قلتُ: صِفهُ لِي منطقًا، قالَ: "كان رسولُ اللهِ ﷺ متواصِلَ الأحزانِ، دائمَ الفِكرةِ، ليست له راحة، لا يتكلم في غير حاجةٍ، طويلَ السكُوتِ، يفتَتِحُ الكلامَ بأشْداقِهِ، يتكلَّمُ بجَوامِعِ الكَلِمِ، كلامه فصل، لا فضول ولا تقصير، دمِث، ليس بالجافي ولا مهين، يُعظِّم النعمة وإن دقّت، لا يذمُّ منها شيئا ولا يمدحه، ولا يقومُ لغضبِهِ-إذا تُعرِّضَ للحقّ-حتى ينتصر له، وفي رواية:لا تغضبه الدنيا وما كان لها، فإذا تُعرِّض للحقّ، لم يعرِفْهُ أحد ولم يقم لغضبه شيء حتى ينتصر له، لا يغضب لنفسه ولا ينتصر لها، إذا أشارَ أشارَ بِكَفّهِ كلّها، وإذا تعجّب قلّبها، وإذا تحدث

يصل بها يضرب براحته اليمنى باطنَ إبهامه اليسرى، وإذا غضِب أعرضَ وأشاحَ، وإذا فرِح غضَّ طرفَه، جُلّ ضحكه التبسم، يفترّ عن مثل حبّ الغمام.

اندازِ گفتگو

حضرت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ سے عرض کیا کہ آنحضرت ﷺ کے "اندازِ گفتگو" کو بیان فرمایئے، انہوں نے کہا:

رسول اللہ ﷺ پر گہرے غم کے آثار نمایاں رہتے، جیسے ایک رنج کے بعد دوسرا رنج، ایک غم کے بعد دوسرا غم آپؐ پر طاری ہے، (پیغامِ رسالت کو قبول کرنے میں لوگوں سے کوتاہی ہوتی اور آخرت کی فکر میں کمی آنے کا جو آپؐ کو درد ہوتا تھا اس کو بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ "متواصل الأحزان" تھے - ایک غم کے بعد دوسرا غم آپؐ کو رہتا - یعنی رنج و غم سے کوئی لمحہ خالی نہیں رہتا)، ہمیشہ ایک گہری فکر آپؐ پر طاری رہتی، آپؐ کے لئے دنیا میں راحت مقدر نہیں تھی، بلا ضرورت بات نہ کرتے، دیر تک آپؐ پر سکوت طاری رہتا، بات کرتے تو پورا دہانہ کھول کر صاف الفاظ منہ سے نکالتے، (ایسا نہیں کہ گھُٹن سے ایک لفظ کہہ دیا، کسی نے سنا اور کسی نے نہیں سنا، جیسے دنیادار متکبر لوگ کرتے ہیں)، آپؐ کی گفتگو الفاظ و

معانی کے لحاظ سے بھرپور ہوتی، (”جوامع الکلم“ کا یہی مفہوم ہے) آپؐ کی ہر بات الگ الگ ہوتی، (ایک بات سے دوسری بات کا جوڑ نہیں ملاتے) نہ ضرورت سے زیادہ بولتے اور نہ بات کو تشنہ رکھتے، آپؐ انتہائی نرم خو تھے، نہ تو اکھڑ مزاج تھے اور نہ مزاج میں ذرا بھی گراوٹ تھی، نعمت اگر بظاہر معمولی بھی ہوتی تو اس کی قدردانی فرماتے، نہ اس کی تحقیر کرتے اور نہ اس کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے، اگر حقانیت پر کوئی حرف لاتا تو پھر آپؐ کے غضب کو کوئی روک نہیں سکتا تھا، اور آپؐ کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوتا جب تک کہ حق و صداقت کی جیت نہ ہوجاتی۔

آپؐ اپنی ذات کے لئے کبھی غضبناک نہیں ہوئے اور نہ اپنی بات اونچی رکھنے کی کوشش کرتے، جب (گفتگو میں) اشارہ کرتے تو پورے کفِ دست کو کھول کر اشارہ کرتے، اور جب کسی بات پر تعجب کا اظہار فرماتے تو ہتھیلی کو الٹتے پلٹتے، اور جب محوِ کلام ہوتے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے جوڑ لیتے اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ٹھوکر لگاتے، جب خوش ہوتے تو نگاہ نیچی کرلیتے، آپؐ کی ہنسی مسکراہٹ سے زیادہ نہیں ہوتی اور مسکراہٹ میں کبھی دندانِ مبارک برف کے اولے کی طرح نظر آتے۔

أدبه ﷺ في دخول بيته

قال الحسين : سألتُ أبي عن دخول رسول لله ﷺ فقال: "كان دخولًا لنفسه مأذونا له في ذلك، وكان إذا آوى إلى سنزله جزًأ دُخوله ثلاثة أجزاء، جُزاءً لله، وجُزأ لأهله، وجُزأ لنفسه، ثُمّ جَزًأ جُزْءَ ه بينه و بين الناس، فردّ ذلك على العامة والخاصة لا يدّخر عنهم شيئا، وكان من سيرته في جُزءِ الأمة إيثار أهل الفضل بإذنه، وقسّمه على قدر فضلهم في الدين، فمنهم ذوالحاجة ومنهم ذو الحاجتين، ومنهم ذوى الحوائج، فيتشاغل بهم و يُشْغِلهم فيما يصلحهم ، والأمة، من مسألته عنهم و إخبارهم بالذي ينبغي لهم، ويقول: "ليبلغ الشاهد الغائب، وأبلِغُوني حاجةَ مَن لا يستطيع إبلاغي حاجته، فإنه مَن أبلغ سلطانا حاجةَ مَن لا يستطيع إبلاغها إياه ثبت الله قدميه يوم القيامةِ،" لا يذكر عنده إلا ذلك، ولا يقبل مِن أحد غيره، يدخلون عليه روادا ولا يفترقون إلا عن ذوق–ويخرجون أدلة– يعني على الخير.

اوقات کی تقسیم، اندر آنے جانے کا معمول

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والدِ ماجد (سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) سے دریافت کیا کہ

رسول اللہ ﷺ کے گھر آنے اور گھر سے نکلنے کا کیا معمول تھا؟ فرمایا:

گھر کے اندر تشریف لانے کی آپؐ کو ہر وقت اجازت تھی، جب اپنے حجرے میں تشریف لاتے تو اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے، ایک حصہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا، ایک حصہ اپنے افرادِ خاندان کے لئے اور ایک حصہ اپنی ذات کے لئے، (یعنی ایک حصہ عبادت میں صرف ہوتا، دوسرا حصہ اہلِ خانہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں اور ایک حصہ آرام و استراحت میں صرف ہوتا)، جو حصہ اپنی ذات یعنی آرام و استراحت کا ہوتا اس کو اپنی ذات اور حاجت مندوں کے درمیان بانٹ دیتے، جن اوقات میں حاجت مندوں کی باتیں سنتے وہ عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں تھے۔

ان لوگوں میں جن اصحاب کا تعلق دین سے زیادہ ہوتا ان کو زیادہ ترجیح دیتے اور ان میں بھی ترتیب ملحوظ رہتی، حاجت مندوں میں کوئی ایسا ہوتا جس کی ایک حاجت ہوتی، کوئی دو ضروتوں کے لئے آتا، کوئی متعدد حاجتیں لے کر آتا، آپؐ ہر ایک کی فکر میں شریک ہوتے اور اُن حضرات کو ایسے کام میں لگا دیتے جو ان کے لئے نفع بخش ہوتا، اور ان کے سوال کا جواب بھی مرحمت فرماتے، اس سے امت کو نفع بھی پہنچتا، اور فرمایا کرتے: ”جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک ہماری بات پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، اور مجھے ان لوگوں کی ضروریات سے

آگاہ کرو جو لوگ مجھ تک آکر اپنی حالت نہیں بتا سکتے، کیوں کہ جو شخص سلطان تک اس شخص کی بات پہنچائے گا جس کو وہ خود نہیں پہنچا سکتا تھا تو اللہ قیامت کے روز اس کے قدم ثابت رکھے گا"۔ آنحضرت ﷺ کے حضور ایسے شخص کا ذکر ہوتا تو آپؐ صرف اس کی حاجت کی طرف متوجہ رہتے، جو لوگ آپؐ کی خدمت میں طلبِ خیر کے لئے حاضر ہوتے جب تک آپ ان کو کھلاتے پلاتے نہیں ان کو اپنی خدمت سے جدا نہیں فرتے۔

أدبه ﷺ في خروجه عن بيته

قال و سألته عن مخرجه كيف كان يصنع فيه؟ فقال : "كان رسول الله ﷺ يخزن لسانه إلا بما يعنيه، ويؤلفهم ولا ينفرهم، ويكرم كريم كل قوم ويوليه عليهم، ويحذر الناس ويحترس منهم من غير أن يطوي على أحد منهم بِشْرَه ولا خُلُقَه، يتفقد أصحابه، ويسأل الناس عما في الناس، ويحسِّن الحسن ويقوِّيه، ويُقبِّح القبيحَ ويُوهِّيه، معتدل الأمر غير مختلف، لايغل مخافة أن يغفلوا أو يميلوا، لكل حال عنده عتاد، ولا يُقصّر عن الحق ولا يجوِّزه، الذين يلونه من الناس خيارهم، أفضلهم عنده أعمهم نصيحةً، وأعظمهم منزلة عنده أحسنهم مواساة وموازرةً.

قیام گاہ سے باہر جانے کا معمول

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما اپنے والدِ ماجد سے مزید روایت کرتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ آپؐ کے گھر سے نکلنے کا کیا معمول تھا؟ فرمایا:

رسول اللہ ﷺ اپنی زبان بند رکھتے تھے، صرف اسی بات کے لئے منہ کھولتے جس سے آپؐ کو کوئی سروکار ہو، لوگوں کو ملاجلا کر رکھتے، اپنے سے جدا نہیں کرتے، ہر قبیلہ کے بڑے آدمی کا اکرام کرتے اور (جب وہ کسی وفد وغیرہ میں اپنے لوگوں کے ساتھ آتا تو) اس کو ''قائدِ قبیلہ'' کا مقام دیتے، لوگوں کو تمیز سکھاتے اور ان کی اکھڑ زبانی بھی سن لیتے، مگر کبھی آپ کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا، اور نہ آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ میں کوئی فرق آتا۔ صحابہؓ کرام میں سے کوئی موجود نہیں ہوتا (یا کسی روز نہ آیا ہوتا) تو اس کو تلاش فرماتے، لوگوں سے ایک دوسرے کی خیریت و حالات معلوم فرماتے، کوئی اچھا کام کرتا تو اس کی عزت افزائی فرماتے اور اس کی ہمت بندھاتے، اور برائی کو واضح کرتے کہ یہ برائی کی بات ہے اور اس کام کے کمزور پہلو کو واضح فرماتے۔

آپؐ کی باتیں یکساں اور اعتدال پر قائم تھیں، کبھی کچھ اور کبھی کچھ کی صورتِ حال نہ تھی۔ کسی برائی سے روکنے میں آپؐ جھجک

نہیں فرماتے کہ اس کو واضح کرنے سے فلاں شخص برگشتہ ہو جائے گا اور آپؐ سے جدا ہو جائے گا، ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے آپؐ کے پاس حل ہوتا تھا، حق کے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں فرماتے اور نہ اس کو جائز ٹھہراتے، آپؐ سے زیادہ قربت انہی حضرات کو تھی (جو دین کے اعتبار سے) زیادہ منتخب لوگ تھے، آپؐ کے حضور افضل شخص وہ شمار ہوتا جو لوگوں کا زیادہ خیر خواہ ہو، آپؐ اس شخص کی زیادہ عزت فرماتے جو لوگوں کا زیادہ غم خوار اور مدد گار ہوتا۔

أدبه ﷺ في مجلسه

قال: فسألته عن مجلسه كيف كان؟ فقال: "كان رسول الله ﷺ لا يجلس ولا يقوم إلا على ذكر،ولا يوطن الأماكن وينهى عن إيطانها، وإذا انتهى إلى قوم جلس حيث ينتهي به المجلس ويَمر بذلك، يعطي كل جلسائه نصيبه، لا يحسب جليسه إن أحدًا أكرم عليه منه، مَن جالسه أو قاومه في حاجة صابَرَه حتى يكون هو المنصرف عنه، ومن سَله حاجة لم يردّه إلا بها أو بميسور من القول، قد وسع الناس منه بسطُه وخلقُه فصار لهم أبا و صاروا عنده في الحق سواء،مجلسُه مجلسُ علمٍ و حياءٍ وأمانةٍ، لا تُرفع فيه الأصواتُ، ولا تؤبن فيه الحرم، ولا تُنثى فلتاته، متعادلين يتفاضلون فيه بالتقوى، متواضعين يوقرون فيه

الکبیر ویرحمون الصغیر، یُؤثِرون ذا الحاجۃِ، ویحفظون الغریب.

آپؐ کی مجلس

آپؐ کی مجلس کیسی ہوتی تھی ؟ میرے اس سوال کے جواب میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا :

رسول اللہ ﷺ جب بیٹھتے یا بیٹھ کر اٹھتے تو اللہ کا نام لیتے، مسجد میں اپنے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں فرماتے، اور لوگوں کو اس سے منع کرتے کہ کسی جگہ کو مخصوص کر کے قبضہ جمائے رہیں، جب کسی محفل میں تشریف لے جاتے تو وہاں جاکر بیٹھتے جہاں مجلس کا آخری آدمی بیٹھتا اور اس کی دوسروں کو ترغیب دیا کرتے، اور اپنے تمام ہم نشینوں کو ان کی حیثیت کے مطابق مقام عطا فرماتے، آپؐ کا کوئی ہم نشیں یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس سے زیادہ کوئی دوسرا اس کے مقابل میں معزز ہے، جو شخص اپنی ضرورت کے لئے آپؐ کے ساتھ بیٹھتا یا کھڑا ہوتا تو اس کی بات صبر سے سنتے رہتے، یہاں تک کہ وہ خود واپس جاتا، کوئی اپنی حاجت آپؐ کے سامنے رکھتا تو اس کی ضرورت پوری فرماتے اور اگر بس میں نہ ہوتا تو میٹھے بول سے اس کی دلجوئی فرماتے۔

آپؐ کی دریا دلی، سخاوت اور اخلاق سے سب کے سب بہرہ مند ہوتے، (گویا) آپؐ سب کے لئے باپ کا مرتبہ رکھتے اور سب آپؐ کے نزدیک حق کے معاملہ میں یکساں درجہ رکھتے، آپؐ کی مجلس شرم

و لحاظ، عفو و بخشش اور درگذر، صبر اور امانت کی مجلس ہوتی تھی۔ آپؐ کی مجلس میں لوگ بلند آواز سے بات نہیں کرتے، کسی شخص کی غیبت یا برائی نہیں ہوتی تھی، کسی کے عیوب نہیں گنائے جاتے، سب کے سب برابر کا درجہ رکھتے، ایک دوسرے سے سبقت صرف خدا ترسی میں لے جاتے تھے، سب پر انکساری و خاکساری کی کیفیت طاری رہتی، آپؐ کی مجلس میں بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت کا برتاؤ عام تھا، ضرورت مند کی حاجت روائی کو ہر کام پر ترجیح دیتے اور اجنبی شخص کی خبر گیری کرتے تھے۔

سيرة جلسائه ﷺ

قال: فسألته عن سيرة جلسائه، فقال: كان رسول الله ﷺ دائم البِشر، سهْل الخُلق، ليّن الجانب، ليس بفظ ولا غليظ، ولا سخّاب، ولا فحّاش، ولا عيّاب، ولا مزّاح، يتغافل عما لا يشتهي، ولا يؤيس منه راجيه، والا يخيّب فيه، قد ترك نفسه من ثلاث: كان لا يذم أحدًا ولا يعيّره، ولا يطلب عورته، ولا يتكلم إلا فيما يرجو ثوابه، إذا تكلّمَ أطرقِ جلساؤه كأنما على رؤوسهم الطير، فإذا تكلّم سكتُوا وإذا سكَتَ تكلّمُوا، ولا يتنازعون عنده، يضحك مما يضحكون، ويتعجب مما يتعجبون، ويسبر للغريب على الجَفْوَة في منطقه ومسألته حتى

إن كان أصحابه ليستحلبونه في المنطق ، ويقول: إذا رأيتم صاحب حاجة فأرْفِدُوه، ولا يقبل الثناء إلا من مكافيء، ولا يقطع على أحد حديثه حتى يجور، فيقطعه بنهي أو كلامٍ.

ہم نشینوں کے ساتھ طرزِ عمل

رسول اللہ ﷺ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے؟ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بتایا:

رسول اللہ ﷺ ہمیشہ بشاش رہتے تھے، ("دائم البشر" کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کبھی ناک بھوں چڑھائے منھ سکوڑے نہیں رہتے تھے، بلکہ چہرہ کھلا ہوا رہتا تھا)، آپؐ کے اخلاق وعادات میں نرمی اور سبک روی تھی، کج خلقی یا سخت گیری کا کوئی اثر آپؐ کی سیرت میں نہیں ملتا تھا، نہ چیخ چلا کر کبھی بات کرتے، نہ کسی کو شرمندہ کرنے والا لفظ زبان سے نکالتے، نہ کسی کی عیب جوئی کرتے اور نہ ہنسی مذاق کی بات کرتے، جس بات کو ناپسند کرتے اس بات سے بے تعلق رہتے، کوئی شخص آپؐ سے کوئی توقع قائم کرتا تو مایوس نہیں ہوتا اور ناکام نہیں رہتا۔

تین باتوں سے مکمل پرہیز آپؐ کی طبیعت اور مزاج کا خاصہ تھا: جھگڑا کرنا، احسان جتلانا اور جس بات سے کوئی سروکار نہ ہو اس کے پیچھے پڑنا، اسی طرح تین باتوں میں آپؐ نے کسی کو ملوث نہیں کیا: کسی کی کبھی مذمت نہیں کی اور نہ اس کو شرم دلائی، نہ اس سے کسی

راز کی بات پوچھی، اور صرف اس موضوع پر گفتگو فرمائی جس میں ثواب کی امید ہو، جب آپؐ گفتگو فرماتے تو حاضرینِ مجلس اس طرح سر جھکا کر (محو ہو کر) آپؐ کی بات سنتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، (کہ جہاں سر ہلایا وہ اڑ جائیں گے) آپؐ کے حضور بیٹھے ہوئے حضرات آپس میں تُوتُو مَیں مَیں نہیں کرتے، جس بات پر لوگوں کو ہنسی آتی آپؐ بھی اس پر تبسم فرماتے، جس پر دوسروں کو حیرت ہوتی آپؐ بھی حیرت فرماتے۔

کوئی اجنبی (باہر کا آیا ہوا بدّو جو اپنے قبیلہ کی بولی بولتا اور اپنی عادت کے مطابق مخاطب کرتا) آتا تو اس کی بے تکی اور غیر مانوس بات اور اس کے سوال کو غور سے سنتے اور توجہ سے اس کا کام نمٹاتے،اگر چہ صحابہؓ کرام کو ان بدوّوں کی باتوں سے وحشت محسوس ہوتی تھی، (مگر) آپؐ فرمایا کرتے تھے: اگر کسی حاجت مند کو دیکھو تو اس کی مدد کرو، لوگوں کی ثناخوانی قبول نہیں فرماتے اِلّا یہ کہ کسی کے ساتھ احسان کیا ہو اور وہ ایک دو کلمۂ خیر کہہ دے، (ایک دو لفظ شکریہ اور ثنا خوانی کے کہہ کر کہنے والا سمجھتا ہے کہ اس نے اس احسان کا عوض کردیا اور اس کو تسکین ہو جاتی ہے، اس لئے اس کی تسکین کی خاطر اس کی خوش کلامی یا ثناخوانی اور شکریہ کو قبول کر لینا بھی ایک طرح کا احسان ہے) آپؐ کی مجلس میں کوئی بات کرتا تو اس کا "قطعِ کلام" نہیں کرتے،ہاں اگر وہ حد سے آگے بڑھ رہا ہو تو اس کو روک دیتے یا مجلس برخواست کر دیتے۔

سكوته ﷺ

قال: فسألته كيف كان سكوته؟ قال: "كان سكوته على أربع: الحلم، و الحذر، والتقدير، والتفكر، فأما تقديره ففي تسويته النظر والاستماع بين الناس، وأما تذكره - أو قال: تفكره-ففيما يبقى ويفنى، وجُمع له ﷺ الحلم والصبر، فكان لا يغضبه شيء ولا يستفِزّه، وجُمع له الحذر في أربع: أخذه بالحسنى، والقيام لهم فيما جمع الدنيا والآخرة، ﷺ (۱)

آپؐ کی خاموشی

آپؐ کے سکوت کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا:

آپؐ چار باتوں پر سکوت فرماتے: حلم، حذر، تقدیر اور تفکیر۔

"تقدیر" کا مطلب یہاں اس حدیث میں معیار قائم کرنا اور ہر ایک بات معتدل انداز سے سننا --- "تذکرّ" یا "تفکّر" : اُن باتوں

(۱) وقد روى هذا الحديث بطوله الترمذي في الشمائل عن الحسن بن علي رضي الله عنهما، و فيه حديثه عن أخيه الحسين عن أبيه علي بن أبي طالب . وقد رواه البيهقي في "الدلائل" عن الحاكم بإسناده عن الحسن،كذا ذكر الحافظ ابن كثيرفي "البداية"(٦/٣٣)والحاكم في "المستدرك"(٣/ ٦٤٠)، وأخرجه أيضًا الروياني والطبراني وابن عساكر كما في "كنز لاعمال"(٤/٣٢)،والبغوي كما في "الإصابة"، و ذكرفي "الكنز" في آخره: و جمع له الحذر في أربع:أخذه بالحسنى ليقتدى به، و ترك القبيح ليتناهى عنه، واجتهاده الرأي فيما أصلح أمته، والقيام فيما جمع لهم الدنيا والآخرة، و هكذا ذكره في "المجمع"(٨/٢٧٥)عن الطبراني.

پر غور کرنا کہ دنیا میں کیا رہا ہے اور کیا رہے گا --- "حلم" یعنی بردباری : لوگوں کی باتوں پر صبر کرنا، چنانچہ آپؐ نہ کسی بات پر چراغ پا ہوتے اور نہ کسی کو ٹھکراتے --- "حذر" کا اظہار آپؐ کی چار باتوں سے ظاہر ہوتا : اچھی بات کا پابند ہونا، ناپسندیدہ باتوں سے باز رہنا تاکہ لوگ بھی اس سے پرہیز کریں، اور ایسے کام کے لئے کمربستہ ہونا جس میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی بھلائی ہو، اور ایسے طریقِ کار کو اختیار کرنا جو آپ کی امت کو صحیح راستے پر لگادے۔

مذکورہ بالا حدیثیں شمائلِ ترمذی اور دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں، صحیح بخاری میں باب "صفة النبی ﷺ" کے زیرِ عنوان حسبِ ذیل حدیثیں مذکور ہیں :

عن عقبه بن الحارث قال: صلى أبوبكر رضي الله عنه العصر ثم خرج يمشي ، فرآى الحسن يلعب مع الصبيان فحمله على عاتقه، وقال: بأبي، شبيه بالنبي لا شبيه بعلي،و علي يضحك۔

حضرت عقبہ بن الحارث فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عصر کی نماز پڑھی پھر گھر سے چہل قدمی کرتے ہوئے باہر نکلے تو دیکھا کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر ان کو اپنی گردن پر بٹھا لا اور فرمایا: میرے باپ کی قسم، یہ نبی علیہ السلام کے مشابہ ہیں نہ کہ

علی کے مشابہ، حضرت علیؓ یہ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

عن أبي جحيفة رضي الله عنه قال: رأيت النبي ﷺ، وكان الحسن يشبهه

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، حسنؓ ان سے بہت مشابہ تھے۔

عن إسماعيل بن خالد قال: سمعت أبا جحيفة رضي الله عنه قال: رأيت النبي ﷺ كان الحسن بن علي عليهما السلام يشبهه، قلت لأبي جحيفة:صفه لي، قال: كان أبيض قد شَمِطَ، و أمرلنا النبي ﷺ بثلاث عشرة قَلوصًا، قال: فقبض النبي ﷺ قبل أن نقبضها.

حضرت اسماعیل بن خالدؒ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو جحیفہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو قریب سے دیکھا، ان سے حضرت حسن بن علی علیہما السلام مشابہت رکھتے تھے، میں نے ابو جحیفہؓ سے کہا: مجھ سے ان کا سراپا بیان کیجئے، انہوں نے فرمایا: آپؐ گوری رنگت کے تھے، ریشِ مبارک کے چند بال سفید ہوگئے تھے، نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا تھا کہ ہمیں تیرہ اونٹنی دی جائیں، لیکن ان پر قبضہ سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔

جرير بن عثمان أنه سأل عبد الله بن بسر صاحب النبي

ﷺ ، قال: أرأيت النبي ﷺ كان شيخًا؟قال: كان في عَنْفَقَته شعرات بيض.

حضرت جریر بن عثمانؒ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی عبد اللہ بن بسرؓ تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تھا؟ کیا آپؐ بوڑھے نظر آتے تھے؟انہوں نے کہا: زیر لب ریشِ مبارک کے گھنے بالوں کے اوپر (جس کو بعض لوگ داڑھی بچہ بھی کہتے ہیں) چند بال سفید تھے۔

عن ربيعة بن عبد الرحمان قال: سمعت أنس بن مالك يصف النبي ﷺ ، قال: كان ربعة من القوم، ليس بالطويل ولا بالقصير، أزهر اللون، ليس بأبيض أمهق ولا آدم، ليس بجَعْد قطَط،ولا سبُط رجُل، فلبث بمكة عشر سنين يُنْزل عليه، و بالمدينة عشر سنين، وليس في رأسه ولحيته عشرون شعرة بيضاء قال ربيعة: فرأيت شعرا من شعره، فإذا هو أحمرّا! فسألتُ، فقيل: احمرَّ من الطيب.

حضرت ربیعہ بن عبد الرحمانؒ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ کو رسولِ کریم ﷺ کے نقش وسراپا کو بیان کرتے ہوئے سنا، وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت ﷺ لوگوں میں درمیانی قد و قامت کے معلوم ہوتے تھے ، نہ بہت لانبے اور نہ بہت کوتاہ قد، کھلتا ہوا رنگ تھا، ایسے گورے بھی نہیں جیسے چونا اور نہ ایسا گیہوانہ رنگ کہ چہرے

کے جیسا معلوم ہو، بال گھنگریالے پن کی طرف مائل تھے نہ کہ سیدھے سپاٹ، آپؐ پر وحی اس وقت آئی جب آپؐ کی عمر شریف چالیس سال کی تھی،مکہ مکرمہ میں دس سال قیام فرمایا اور نزولِ وحی کا تسلسل قائم رہا اور مدینہ منورہ دس سال رہے،آپؐ کے سر اقدس اور ریشِ مبارک میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے، حضرت ربیعہؒ نے کہا کہ میں نے موئے مبارک کے چند بال دیکھے ہیں وہ مجھ کو سرخ نظر آئے، میں نے اس کی تشریح چاہی تو فرمایا کہ عطر کے استعمال سے یہ بال سرخی مائل ہوگئے تھے۔

عن أبي إسحاق قال: سمعت البراء يقول: كان رسول الله ﷺ أحسن الناس وجهًا، وأحسنهم خُلقًا، ليس بالطويل البائن، ولا بالقصير.

حضرت ابو اسحاقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ چہرے کے اعتبار سے بہت حسین تھے اور آپؐ کا سراپا بھی بہت حسین تھا، قدوقامت ایسا نہیں تھا جس کو طویل کہا جائے اور نہ ایسا تھا جس کو پستہ قد کہا جائے۔

عن قتادة قال: سألت أنسًا ، هل خضب النبي ﷺ؟ قال: لا، إنما كان شيء في صدغيه.

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپؐ نے کبھی خضاب لگایا تھا؟ انہوں نے

فرمایا: نہیں، ہاں دونوں کنپٹیوں پر کچھ محسوس ہوتا تھا۔ (یعنی جیسے خضاب لگا ہو، مگر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے)۔

چہرہ مبارک کا چودھویں کے چاند کی طرح ہونا

عن أبي إسحاق عن البراء بن عازب رضى الله عنه قال: كان النبي ﷺ مربوعًا، بعيد ما بين المنكبين، له شعر يبلغ شحمة أذنيه، رأيته في حلة حمراء، لم أر شيء قط أحسن منه، قال يوسف بن إسحاق عن أبيه: إلى منكبيه.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایاکہ رسول اللہ ﷺ درمیانہ قد کے تھے، آپؐ کے دونوں شانے ایک دوسرے سے دور لگتے تھے، (یعنی آپؐ کا سینہ چوڑا تھا) آپؐ کے گیسو کان کے لو تک پہنچے ہوئے تھے،میں نے آپؐ کو سرخ عبا پہنے ہوئے دیکھا، میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو حسین نہیں پایا، (اس روایت میں جو لفظ آیا ہے کہ آپؐ کے گیسو کان کے لو تک تھے، حضرت یوسف بن اسحاقؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ کے گیسو آپ کے دونوں شانوں تک تھے۔)

عن أبي إسحاق قال: سُئل البراء: أكان وجه النبي ﷺ مثل السيف؟ قال: لا، بل مثل القمر.

حضرت ابو اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کی چمک

تلوار جیسی تھی؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ چاند جیسی (۱)۔

عن جابر بن سمرة قال: رأيت رسول اللهﷺ في ليلة أضحيان و عليه حلة حمراء، فجعلت أنظر إليه و إلى القمر، فلهو عندي أحسن من القمر. (۲)

شمائلِ ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے چودھویں کی چاند رات کو رسول اللہ ﷺ کو دیکھا وہ سرخ عبا پہنے ہوئے تھے، میں کبھی آپؐ کی طرف دیکھتا کبھی چاند کی طرف، آنحضرتﷺ مجھ کو چاند سے کہیں زیادہ تابناک نظر آتے تھے۔

اس واقعہ کو شمائلِ ترمذی کے مترجمین، شارحین اور صوفیاء نے بہت ذوق و شوق اور محبت کے لہجے میں بیان کیا ہے، اس واقعہ پر حسّان الھند مولانا تمنّا عمادی مرحوم کا یہ شعر بہت معنی خیز اور دل آویز ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

---

(۱) حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی مدح میں یہ شعر کہا تھا: " إن الرسول لسيف يستضاء به" یعنی آپؐ کا چہرہ اس تلوار کی روشنی کے مانند تھا جس سے اجالا پھیل جاتا ہے، اہلِ عرب سفیدی یا روشنی کو اپنے مشاہدے کے مطابق تلوار کی چمک اور چاند سے دیا کرتے تھے۔

(۲) رواه الترمذي في الشمائل في باب ماجاء في خُلُق رسول الله ﷺ

باب فی خُلُقِ النبی ﷺ

امام ترمذیؒ کی شمائلِ محمدیہ اور امام بخاریؒ کی صحیح میں نبی کریم ﷺ کا حلیہ و سراپا اور آپؐ کے عادات و معمولات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، چونکہ لفظِ "شمائل" حلیہ اور سراپا اور عادات و معمولات دونوں پر مشتمل ہے، اس لئے مذکورہ بالا احادیث میں جو بابِ اول میں ذکر کی گئیں، ان سے دونوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، مگر امام بخاریؒ نے آپ کی صفات کو "خُلُق" کے ساتھ باندھا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے مسند میں بھی آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کو علاحدہ عنوان کے تحت نقل کیا ہے، اس لئے ان کی اتباع میں ہم شمائل و صحاح کے بعد آپؐ کے مکارمِ اخلاق کو علیحدہ باب میں نقل کر رہے ہیں۔

آپؐ کے مکارمِ اخلاق کی پہلی شہادت ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دی اور آپ کی شہادت سب سے زیادہ وقیع ہے، اس لئے کہ گھر سے باہر والوں کے سامنے زندگی کا صرف ایک پہلو ہوتا

ہے اور اہلِ خانہ کے سامنے ایک ایک نقش ونگار سامنے ہوتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے حالات پر جتنی نظر رکھتی ہے اس قدر کسی دوسرے کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔

حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کے بارے میں جو الفاظ فرمائے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی، مختصر الفاظ، سلجھے ہوئے اور پیوست جملے، خالص عربی لہجہ، پُر جلال اور پُر وقار اندازِ بیان اور صدق وصداقت کا ایسا نمونہ جو صحفِ سماویہ کے بعد کہیں نہیں دیکھا گیا۔

جب حضورِ اکرم ﷺ پر پہلی وحی آئی ہے اور جبلِ نور کے غارِ حرا میں حضرت جبریل کے ذریعہ سورتِ "إقرأ" کی پہلی پانچ آیتیں نازل ہوئیں، آپؐ پر لرزہ طاری ہوگیا اور خوف ودہشت کی ایک انجانی کیفیت آپؐ پر طاری تھی، آپؐ وہاں سے سیدھے گھر تشریف لائے، کانپ رہے تھے، ام المؤمنینؓ سے کہا: زمّلوني، زمّلوني، مجھ کو چادر اڑھاؤ، مجھ کو چادر اڑھاؤ، اور فرمایا: "لقد خشيت على نفسي" یعنی مجھے اپنی زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے، اس پر ام المؤمنین نے فرمایا:

كلا، والله ما يخزيك الله أبدا، إنك لتصل الرّحم، وتحمل د الكَلّ، و تكسب المعدوم،	بخدا، اللہ آپکو کبھی نامراد نہیں رکھے گا، آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں، مفلس اور بے سہارا کے

تقري الضيف، و تعين علي نوائب الحق. معاش کا ذریعہ بنتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور کسی پر کوئی افتاد پڑے تو اس کی مدد فرماتے ہیں۔

ام المؤمنین کی یہ شہادت اس وقت کی ہے جب قرآنِ کریم کی صرف پانچ آیتیں نازل ہوئی تھیں، بعد میں جب نزولِ وحی کا تسلسل قائم ہوا اور ایمان لانے والوں کے مقابلے میں منکرین سامنے آئے اور بدگوئی اور دریدہ دہنی کے کھلے عام مظاہرے ہونے لگے تو سورت "القلم" میں آنحضرت ﷺ کو مخاطب کرکے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ [القلم : ۴] اور بے شک آپ اخلاق(حسنہ) کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔

اسی طرح جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: "کان خُلُقُه القرآن" یہ بہت جامع اور وسیع معانی پر محیط جملہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جو فضائلِ اخلاق مذکور ہیں وہ سب آپؐ کے اندر پائے جاتے تھے۔

قرآنِ کریم میں جو ایک مؤمنِ صادق کی صفت اور مؤمنانہ اخلاق وارد ہوئے ہیں ان کو حضرت مولانا سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے یکجا بیان فرمایا ہے، جن کا تعلق اخلاق وانسانیت، حسنِ معاشرت اور حسنِ معاملات سے ہے، اس عاجز وراقم نے "خطباتِ حیدر آباد" میں ان کو

یکجا نقل کیا ہے اور موضوع کا تقاضہ ہے کہ یہاں بھی ان کو نقل کر دیا جائے جس سے ''کان خُلُقُه القرآن'' کی تفصیل آئینے کی طرح سامنے آجاتی ہے:

''سچ بولنا - جھوٹ کی برائی - علم بے عمل کی مذمت - عفوِ عام - درگزر - توکل - صبر - شکر - حق پر استقامت - خدا کی راہ میں جان دینا - سخاوت اور خیرات کا حکم دینا - بخل کی برائی - اسراف و فضول خرچی کی ممانعت - میانہ روی کی تاکید - قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی - مسافروں - سائلوں اور غریبوں کی امداد - غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان - فخر و غرور کی برائی - امانت داری - وعدہ کا ایفاء کرنا - عہد کا پورا کرنا - معاہدوں کا لحاظ رکھنا - صدقہ و خیرات - نیکی و بھلائی کی بات کرنا - آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا - کسی کو برا بھلا نہ کہنا - کسی کو نہ چڑانا - نہ برے ناموں سے یاد کرنا - والدین کی خدمت و اطاعت - ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا - حق گوئی - انصاف پسندی - سچی گواہی دینا - گواہی کو نہ چھپانا - جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر - نرمی سے بات کرنا - زمین پر اکڑ کر نہ چلنا - صلح جوئی - اتحاد و اتفاق - اسلامی برادری -

انسانی برادری- اکلِ حلال - روزی خود حاصل کرنا - تجارت کرنا - گداگری کی ممانعت - لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا - اولاد کشی، خود کشی اور کسی دوسرے کی جان لینے کی ممانعت - یتیم کی کفالت - اس کے مال وجائداد کی نیک نیتی سے حفاظت - ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرنا - ملک میں فساد برپا نہ کرنا - بے شرمی کی بات سے روکنا - زنا کی حرمت - آنکھیں نیچی رکھنا - کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا - ستر و حجاب - خیانت کی برائی - آنکھ، کان اور دل کی بازپرس - نیکی کے کام کرنا - لغو سے اعراض - امانت اور عہد کی رعایت - ایثار - تحمل - دوسروں کو معاف کرنا - دشمنوں سے درگذر - بدی کے بدلے نیکی کرنا - غصہ کی برائی - مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ - مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا - فیصلہ میں عدل و انصاف - دشمنوں تک سے عدل وانصاف - صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی - الاہنے کی مذمت - فسق و فجور سے نفرت - چوری - ڈاکہ - رہزنی اور دوسروں کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت - حسنِ نیت اور دل کی پاکیزگی - پاکبازی جتانے کی برائی - رفتار میں وقار

و متانت - مجالس میں حسنِ اخلاق - ضعیفوں - کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی - شوہر کی اطاعت - بیوی کا حق ادا کرنا - ناحق قسم کھانے کی برائی - چغل خوری، طعنہ زنی، اور تہمت دھرنے کی ممانعت - جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت - شرم گاہوں کی ستر پوشی - سائل کو نہ جھڑکنا - یتیم کو نہ دبانا - خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا - غیبت نہ کرنا - بد گمانی نہ کرنا - سب پر رحم کرنا - ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی - قرض دینا - قرض معاف کرنا - سود اور رشوت کی ممانعت - ثباتِ قدم - استقلال اور بہادری کی خوبی - لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی - شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت - بھوکوں کو کھانا کھلانا - ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز - بے غرض نیکی کرنا - مال و دولت سے محبت نہ ہونا - ظلم سے منع کرنا - لوگوں سے بے رخی نہ کرنا - گناہ سے بچنا - ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش - معاملات میں سچائی اور دیانت داری۔"

احادیثِ نبویہ سے آپ کے خصائل و شمائل اور حسنِ اخلاق کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں خاص بات یہ ہے کہ یہ سب بے کم و کاست واقعات ہیں، صحابہ کرامؓ کے مشاہدات ہیں جن میں مبالغہ یا غلو کا

مطلقاً دخل نہیں ہے، شاعرانہ تخیل اور وہمی تصورات سے یکسر پاک ہیں، مسندِ امام احمد بن حنبل میں یہ حدیث صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

إنما بُعثت لأتمم مكارم الأخلاق

میں تو اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

امام مالکؒ نے بھی اپنے مؤطا میں اس حدیث کو نقل فرمایا ہے اور اس کا مستقل باب قائم کیا ہے "باب ما جاء في حسن الخُلُق"

امام ترمذیؒ شمائلِ محمدیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

كان رسول الله ﷺ أجود الناس صدرا، و أصدق الناس لهجة، وألينهم عريكة، وأكرمهم عشيرة، من رآه بداهة هابه، ومن خالطه معرفة أحبه، يقول ناعته: لم أر قبله ولا بعده مثله، ﷺ

آپؐ سب سے زیادہ سخی دل تھے، اور سب سے زیادہ سچی زبان والے، سب سے زیادہ نرم دل اور معاشرت میں سب سے زیادہ با اخلاق، آپؐ کو جو دور سے دیکھتا مرعوب ہوجاتا، مگر جب قریب جاتا تو آپؐ سے محبت کرنے لگتا، آپؐ کی عقیدت سے سرشار ہوجاتا، آپؐ کے اوصاف بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ آپؐ جیسا کسی کو نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا۔

یہ وصفِ سخاوت جو رسول اللہ ﷺ میں تھا اس کو صحابہ کرامؓ اپنی محتاط اور متوازن زبان میں اس طرح کہتے ہیں: "کان رسول اللہ ﷺ أجود الناس صدرًا" یعنی حضورانور ﷺ جود وسخا میں سب سے زیادہ دریا دل تھے، اور جو واقعات بیان کرتے ہیں وہ کوئی خیال اور افسانوں کے انداز کے نہیں ہوتے بلکہ ایسے ہوتے ہیں جن کے سننے میں ایک سلیم الطبع انسان محسوس کرتا ہے کہ آپؐ کی سخاوت، آپؐ کے یقین اور ایمان کا پرتو تھا، مثلاً بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز ایک ذبح کی ہوئی بکری ہدیہ میں آئی، جب شام ہوئی تو آپؐ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ جو بکری آئی تھی اس کا سب گوشت تقسیم ہوگیا؟ ام المؤمنینؓ نے فرمایا: سب تقسیم ہوگیا، صرف ایک ران بچی ہے، آپؐ نے برملا فرمایا: یوں کہو سب باقی رہ گیا سوائے ایک ران کے (۱) یعنی جو غریبوں میں تقسیم ہوگیا وہ سب بچ گیا، اس لئے کا آخرت میں اس کا مکمل اجر ملے گا، کیوں کہ:

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا﴾ [المزمل:۲۰]	اور جو نیک عمل یا جو مال اپنے لئے آگے (ذخیرۂ آخرت بنا کر) بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

(۱) ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ . باب : ۹۸

عالم گیر ضابطہءِ اخلاق

اخلاقِ نبوی کے سلسلہ میں ایک بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ حضورِ انور ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں، اس لئے آپؐ جن اخلاقِ حسنہ سے خود آراستہ تھے اور جن امور کی قرآن پاک نے نشاندہی کی ہے اور وہ اخلاقی گوشے جو آپ کی سیرت میں نمایاں ہیں، وہ تمام قوموں اور زمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ ہیں، جو اصولِ اخلاق سیرت پاک سے اخذ کئے گئے ہیں ان پر عمل پیرا ہوکر دنیا کا ہر فرد، خواہ کہیں کا رہنے والا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، کسی رواج وسماج کا پابند ہو، اس عالم کے لئے رحمت و برکت بن سکتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی مرض کے ازالے کے لئے کوئی دوا کہیں ایجاد ہوتی ہے تو دنیا میں ہر شخص جو اس مرضِ خاص میں مبتلا ہے استعمال کرتا ہے، اسی طرح آج جو مواصلاتی سہولتوں کے ذرائع ہیں، ان کو دنیا کے ہر گوشوں میں قبول کرلیا گیا ہے، یہی حال ان اخلاقِ حسنہ کا ہے جن کو اگرچہ دنیا کے ایک خاص گوشے میں ایک نبیِ امی ﷺ نے اپنے اعمال و اقوال سے متعارف کرایا مگر عالمِ انسانیت کی مشترک دولت ہے، وہ داروئے شفا اور اجتماعی و افرادی امراض کی دوا آج بھی دنیا کی دسترس میں ہے، قرآن کریم نے جن اوصافِ حمیدہ کی تلقین کی ہے، جن کی اجمالی فہرست آپ کے سامنے پیش کی

گئی، کون کہہ سکتا ہے کی صرف عربوں کے لئے تھی، یا صرف ان سے مسلمان ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جن سے صرف مسلم سوسائٹی ہی بہرہ مند ہوسکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین پر اترنے والی وحی اور رحمۃ للعالمین کے عادات وخصائل سے مرتب کیا ہوا ضابطۂ اخلاق سارے عالم کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

قرآن پاک کے بتائے ہوئے ضابطۂ اخلاق پر پھر ایک بار نظر ڈالئے اور دیکھئے، کیا ان میں سے کوئی گوشہ یا شوشہ جو صرف کسی خاص قوم کے درد، دکھ کا علاج کرسکتا ہے دوسروں کا نہیں؟ مثلاً سچ بولنا - عدل و انصاف کرنا - پرایا مال چوری اور ڈاکہ زنی سے حاصل نہ کرنا - ایفائے عہد - تجارتی معاملات میں دھوکا دہی نہ کرنا - ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی دنیا کو آج ضرورت نہ ہو، اسی طرح احادیثِ نبوی سے جو اصولِ اخلاق ملتے ہیں ان میں سے ایک ایک اصول کو لیجئے اور دیکھئے، کیا دنیا اس کی حاجت مند نہیں ہے؟ اور کیا ان اخلاقِ حسنہ کو چھوڑ دینے کے نتیجہ میں مسلمان دنیا میں پسماندگی شکار نہیں ہیں؟ آپ اِس آئینِ اخلاق کا جائزہ لیجئے اور اس کے مقابلے میں جو دنیا میں ہو رہا ہے اس کو دیکھئے، آپ کو صاف نظر آئے گا کہ اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر انسان نے اپنے اوپر کتنا ظلم کیا ہے۔

احادیثِ نبویہ میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال واحکام یا مواعظ و

نصائح ، نظریات اور فارمولے نہیں ہیں بلکہ آپؐ نے خود ان پر عمل کر کے دکھایا ہے، صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے معمولات و معاملات دیکھ کر روایت کی ہے کہ آپؐ کا یہ اُسوہ ہے، مثلاً تواضع اور کرم گستری اخلاقِ نبوی کا اہم باب ہے، مگر ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ نے لوگوں کوخاکساری وفروتنی کی نصیحت کی ہو اور اپنی ذات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہو، حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا:

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الحجر:۸۸] اہلِ ایمان کے لئے اپنے شانے جھکادو، یعنی ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

اسی کے مطابق آپؐ کا معاملہ اللہ کے بندوں کے ساتھ تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا، لیکن آپؐ کو دیکھتے اور اس خیال سے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ آپؐ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ (۱)

آپؐ سے عرض کیا گیا "یا خیر البرِیّة" اے مخلوق میں سب سے افضل، آپؐ نے فرمایا: "ذاك إبراهيم عليه السلام" یہ ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے۔ (۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

(۱) سنن الترمذي، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل،

(۲) مسلم ، كتاب الفضائل، باب من فضل إبراهيم عليه السلام،

فرمایا: میری تعریف وتوصیف اس طرح نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کی تھی، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہو۔ (١)

حضرت عبد اللہ بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس میں کوئی تکلف اور عار نہ ہوتا تھا کہ آپؐ کسی غلام یا بیوہ کے ساتھ چلیں، یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ (٢)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی لونڈیوں اور باندیوں میں سے کوئی آپؐ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جو کہنا ہوتا کہتی اور جتنی دور چاہتی لے جاتی (٣)

عدی بن حاتم جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو اپنے گھر بلایا، باندی نے تکیہ ٹیک لگانے کے لئے پیش کیا، آپؐ نے اس کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھ دیا اور خود زمین پر بیٹھ گئے، عدی کہتے ہیں کہ اس سے میں سمجھ گیا کہ آپؐ بادشاہ نہیں ہیں۔ (٤)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بیمار کی عیادت فرماتے تھے، جنازہ میں شریک ہوتے تھے، گدھے پر بھی

---

(١) بخاری، کتاب الأنبیاء

(٢) بیہقی، باب تواضع رسول اللہ

(٣) الأدب المفرد، باب الکبر

(٤) حوالہء سابق

سواری فرماتے تھے اور غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے۔(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کمزور کے خیال سے اپنی رفتار سست فرما دیتے تھے اور اس کے لئے انتظار فرماتے تھے۔ (۲) حضرت جابرؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جَو کی روٹی اور ایسے سالن پر جس کا مزہ بدل چلا ہو مدعو ہوتے تو بھی قبول فرماتے (۳) انہی سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایامیں بندہ ہوں اور بندے کی طرح کھاتا ہوں اور بندے کی طرح بیٹھتا ہوں۔ (۴)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے یہاں تشریف لائے، میں نے چمڑے کا تکیہ جس میں چھال بھری ہوئی تھی آپؐ کو پیش کیا، آپؐ زمین پر بیٹھ گئے اور تکیہ کو میرے اور اپنے درمیان رکھ دیا۔ (۵)

رسول اللہ ﷺ خود گھر کی صفائی فرمالیتے، اونٹ کو باندھ لیتے، اپنے جانوروں کو چارہ بھی دیتے، اپنے خدمت گار کے ساتھ کھانا

---

(۱) ایضاً۔

(۲) نبی رحمت بحوالہ مسند احمد ۳/۱۹۸-۵۱۲

(۳)زاد المعاد۔

(۴) شمائل ترمذی، الشفاء:۱۰۱۔

(۵) الأدب المفرد

تناول فرماتے اور آٹا گوندھنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور بازار سے سودا بھی لے آتے۔ (۱)

مذہبی دشمنوں یا مخالفوں کے ساتھ اس سے زیادہ اور رواداری کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک میں کمی نہ کی جائے، مشہور جرمن مستشرق نے قرآن کی تفسیروں پر بحث کرتے ہوئے جس کا عربی ترجمہ ''المذاهب في التفسير'' ہے لکھا ہے کہ اسلام میں ایک طرف حسنِ سلوک کی تعلیم ہے، دوسری طرف غیر مسلموں کے ساتھ سختی کے ساتھ برتاؤ کرنے کا بھی حکم ہے، قرآن میں وارد ہے:

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴾ [التوبة: ۱۲۳]

اے ایمان والو، ان کافروں سے لڑو جو تمہاری سرحد پر ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

یہ آیت دراصل اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ رومیوں کا حملہ مسلمانوں کی سرحد پر متوقع تھا اور مسلمانوں کے اندر منافقوں کی ایک جماعت گھس آئی تھی جو اسلام کی دفاعی قوت کو کمزور کرنے

(۱) الشفاء: ۱۰۱، بروایت بخاری

میں مشغول تھی، اور دشمنوں کو مسلمانوں کی دفاعی تدبیریں بتایا کرتی تھی۔ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے اندر مارِ آستین کو پسند نہیں کرتی، جن کو آجکل کے موڈرن اصطلاح میں پانچویں کالم کا فرد سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جب تحریم اور ایلاء کے موقعہ پر جب بعض منافق اہلِ بیتِ نبوی میں پھوٹ ڈال کر انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے تو کفار و منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ [التحریم:۹]	اے پیغمبر، ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کراور ان پر سختی کر اوران کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بازگشت کتنی بری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار و منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام ونظام کی بربادی میں کفار ومنافقین کے ساتھ عملاً شریک ہوگئے تھے، قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدّعا پر غلط استدلال کرتے ہیں اور وہ سورۂ فتح کی حسبِ ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہؓ کرام کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح : ۲۹]

محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور (بھاری) ہیں اور آپس میں محبت رکھتے ہیں۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجمہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ وہ کافروں پر سنگدلی، بے رحمی اور بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنیٰ میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدّتِ ایمان کے سبب ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کرسکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ" کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابلہ میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں ، علامہ زمخشریؒ نے "کشاف" میں، ابنِ حبان نے "بحر المحیط" میں، اور قاضی بیضاوی نے "انوار التنزیل" میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں جو سورہ مائدہ کی اس آیت میں ہے:

﴿ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ [المائدة : ۵۴]

فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورہ ہود میں ہے :

﴿ يٰقَوْمِ أَرَهْطِيْٓ أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [هود:٩٢] اے لوگو، کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے؟

دوسری آیت میں ہے:

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ [التوبة: ١٢٨] تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے:

و رجل شديد : قوي والجمع أشدّاء[1] مردِ شدید ، یعنی قوی اور اس کی جمع اشدّاء ہے۔

قرآن پاک میں أَشَدُّ قُوَّةً، أَشَدُّ خَلْقًا، أَشَدُّ تَثْبِيتًا، أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے ، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لئے گئے ہیں :

﴿اشْدُدْ بِهٖٓ أَزْرِيْ﴾ [طٰہٰ:٣١] اس سے میری کمر مضبوط کر۔

﴿ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ [النبا: ١٢] اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

---

(١) لسان العرب : ج : ٣ ص : ٢١٨۔

﴿وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ﴾ [ص:٢٠] اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔

﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ [محمد :٤] پھر مضبوط باندھو۔

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلے میں مضبوط اور سخت رہے، اور یہی صحابہؓ کرام کی صفت تھی، انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پرواہ نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پُرزور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینے میں جگہ دی، ان کے تیروں کے بوچھار سے لہولہان ہوگئے مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کرچکے تھے پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشن گوئی کی تھی:

﴿سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ [الأنفال:١٢] کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بیٹھا دوں گا۔

وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا:

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ [الأحزاب:٢٦] ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب کو بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ...﴾ (الی آخر الآیۃ)

[الأنفال: ٦٠]

اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو، اور اس کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ساز وسامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل میں آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

اخلاقیات کے ذیل میں معاملات کی تکمیل بھی ہے، دوسرے الفاظ میں اخلاقیات کا اظہار اسی وقت درست ہوگا جب دوسروں سے معاملات ہوں گے، مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں :

"معاملات کا اطلاق فقہاء نے حقوقِ عباد کے ایک خاص حصہ پر

کیا ہے، مثلاً بعض فقہائے شافعیہ نے احکامِ شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے، اور یا امورِ دنیا سے ان کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت، اجارہ، رہن وغیرہ)، اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق، خلع وغیرہ)، اور ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے (جیسے قصاص و سزا اور تعزیرات وغیرہ)"۔

فقہائے کرام کے درمیان معاملات کی اس تقسیم میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی کی ساتویں جلد میں ان اقوال کو جمع کردیا ہے جو سب قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں، اصطلاحات کا فرق ہے، دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحیِ الٰہی کے بجائے عقلِ انسانی پر رکھی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو بنی نوعِ انسانی کی خصوصیات میں شمار فرماتے ہیں کہ جب مختلف قسم کے آدم زاد ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرکے سکون و اطمینان کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو ہر شخص اپنے پیشہ اور موروثی مہارت سے ایسی چیز حاصل کرتا ہے جو دوسرے پیشہ کے لوگوں کے پاس نہیں ہے، اور ہر ایک کی ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے جو دوسرے کے پاس ہے،

جیسے مچھلی شکار کرنے والے کو کپڑے کی ضرورت ہے، اور کپڑا بننے والے کو مچھلی کی حاجت ہے، لہٰذا دونوں اپنی اپنی ضرورتیں ایک دوسرے سے پوری کرتے ہیں، اس سے مبادلہ اور اجارہ کا قانون بنایا گیا، اراضی، فصل اور باغات کا نظام بنا، اسلام نے ان کی عادلانہ تنظیم کردی جس سے نہ کسی کی محنت کا کوئی استحصال کرسکے اور نہ کسی کی ضرورت اٹکی رہے۔

قرآنِ کریم نے معاملات میں توازن کے لئے میزان کی تعبیر اختیار کی ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾ وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔

[الشوریٰ: ۱۷]

﴿ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ الْمِيْزَانَ ﴾ [الحدید: ۲۵] اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

میزان سے مقصود فطرت اور عدل و انصاف کی میزان ہے جس سے ساری کائنات تُل رہی ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جارہے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک ہی لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عمل کے میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾[الرحمن: ۱-۹]

رحمت والا خدا جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں، اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیرِ فرمان ہیں، اور اس نے آسمان کو اونچا کیا، اور اس پر ترازو (میزان) رکھا، تاکہ تول میں کمی و بیشی نہ کرو، اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور تول گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اس سے اعمال و معاملات تولے جاتے ہیں، اس کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے۔

دنیا کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کے مقررہ، طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہا ہے، قرآن پاک میں دوسری جگہوں پر ارشاد فرمایا گیا ہے :

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ اور ناپ تول کو پورا کرتے رہو۔

[الأنعام:۱۵۲]

﴿ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ ناپ اور تول کو پورا رکھو۔

[الأعراف : ۸۵]

﴿ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ ناپ اور تول کو پورا کرو۔

[هود : ۸۵]

﴿ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں،

[هود : ۸۴]

ان آیات میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء مراد لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانہ کو وسیع کیا جائے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں۔ ہر انسانی ظلم کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرں کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے :

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَ إِذَا كَالُوْهُمْ أَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾

پھٹکار ہے ان کم دینے والوں پر، جو اپنے لئے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور ان کو ناپ یا تول کر دینے میں کم کر دیتے ہیں۔

[المطففين : ۱-۳]

اس وقت دنیا کا سار فساد، بد امنی، ایذا رسانی کی تہہ میں یہی

"دوہرا معیار" ہے، اپنی ذات یا اپنے گروہ کے لئے ایک معیار ہے اور کمزوروں اور نہتوں کے لئے دوسرا معیار، رنگ ونسل اور زبان کی بنیاد پر اس وقت دنیا کئی گروہ میں تقسیم کی گئی ہے۔

گوری رنگت والی قوم اپنے لئے دنیا کی تمام عیش و عشرت سمیٹنا چاہتی ہے اور دوسری قوم جو بعینہٖ اسی کی طرح جسمانی ودماغی اعضاء و جوارح رکھتی ہے اور انسان ہونے کے لحاظ سے اس کے اندر کوئی کمی نہیں ہے، وہ اس لئے انصاف اور انسانی حقوق کی مستحق نہیں ہے، کیوں کہ اس کا رنگ کالا ہے، یا وہ فلاں نسل سے ہے جس کی پیدائش اسی غرض سے ہوئی ہے کہ وہ بڑی ذات والوں کی خدمت کرے، ہر ملک میں بے انصافی اور انسانیت کی حق تلفی کا سلسلہ جاری ہے، البتہ شکلیں بدل گئیں ہیں، چھری، چاقو، تیر و تلوار کی جگہ رائفل، بندوق اور اس کے طرح طرح کے اقسام بازار میں آگئے ہیں، مگر "إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ "جب دوسروں سے اپنے حقوق وصول کرتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں لیکن "وَ إِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَزَنُوْهُمْ " جب ان کو دیتے ہیں اور ان کے لئے پیمانۂ انصاف اختیار کرتے ہیں تو "يُخْسِرُوْنَ " کم کر کے دیتے ہیں۔

یہ ناہمواری صرف حکومتوں کی سطح پر اور قوموں کی سطح پر نہیں ہے بلکہ ہر معاشرہ اور ہر قسم کی سوسائٹی میں اس کا زہر پھیل

چکا ہے، اخلاقیات و معاملات دونوں کا توازن بگڑ چکا ہے توازن واعتدال کی میزان سے صرف اسلام نے متعارف کرایا تھا اور جس کو رسولِ کریمؐ اور ان کے صحابہؓ نے عملی طور پر برت کے دکھایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول عدل انصاف کا معیار ہے: ''لین من غیر ضعف، و شدۃ من غیر عنف'' نرمی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ کمزور ہیں اور جب سختی سے پیش آتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ سخت گیری کوئی عادت یا مزاجی کیفیت ہے بلکہ اس لئے کہ محارم اللہ یعنی اللہ کے طے کردہ حدود و نظام کی حفاظت ہو، یہ وہ حدودو نظام ہیں جن کے ناپید ہونے سے دنیا کا ہر فرد مبتلائے مصیبت ہے، قانون پر قانون بنتے ہیں، دستوری کمیٹیاں منعقد ہوتی رہتی ہیں اور ٹوٹتی رہتی ہیں ،کوئی قانون اپنی جگہ پر انسان کو انصاف نہیں دلا سکتا، جہاں انصاف بکتا ہو، عدل کی قیمت لی جاتی ہو وہاں ایک کمزور اور غریب اپنا معمولی حق بھی حاصل نہیں کرسکتا۔

میں یہ بات ایک عموم کے پیرایہ میں عرض کر رہا ہوں اور مثالیں بھی امریکہ اور افریقہ کی پیش کرتا ہوں، ورنہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم جہاں کھڑے ہیں اور جس زمین پر بیٹھے ہیں اس کے اندر بھی بے انصافی اور بد امنی کے شعلے لپک رہے ہیں اور اس کی گرمی سے ساری آبادی جھلس رہی ہے، تفریحات جن کو کبھی INNOCENT یعنی معصوم اور بے ضرر کہا جاتا تھا، آج اس کے ضرر سے ہر خانوادہ

تباہ ہے، ہر پیشہ والا مجبور ہے کہ اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے جھوٹ بولے، بے ایمانی کرے، حکومت کی نظروں سے اپنی مالیت کو چھپائے، یہاں تک کہ ہر طبقہ دوسرے طبقے کو، ہر محکوم اپنے حاکم کو، ہر تاجر اپنے خریدار کو دھوکا دینے پر مجبور ہے، کیونکہ سوسائٹی کی بنیاد "میزان" پر نہیں ہے۔

کسی زمانے میں تجارت ضروریاتِ زندگی، غذا، پانی، لباس، تعمیرات کے سروسامان تک محدود تھی، اب تجارت جنسی جرائم کی ساری دنیا میں جاری ہے، ناول اور افسانے، سنیما اور ٹی وی تک بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ ایسی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں جن سے معصیت کی طلب انسان کے اندر بڑھ جائے اور اس کی قوتِ مقاومت اپاہج ہوجائے، آئے دن خودکشی کی وارداتیں اس لئے بڑھ رہی ہیں کہ خودکشی کرنے والا اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

غرض اس وقت کے حالات اپنی خاص شکل اور نوعیت میں اس دور سے کہیں سنگین ہیں جب کہ اللہ نے جرائم کی پاداش میں پوری پوری بستیوں کو ہلاک کردیا تھا، کہیں پتھر برسا کر، کہیں طوفان کے ذریعہ، کہیں سیلاب لاکر پوری آبادی اس روئے زمین سے ناپید کردی گئی تھی، موجودہ عصر کی آبادی بھی اسی عذاب کی منتظر ہے، اور پوری

دنیا کو خاک سیاہ کردینے والے بم، گولے اور راکٹ تیار موجود ہیں اور ایک لمحہ میں اس پورے تمدن اور پورے مجرمانہ ماحول کو نیست و نابود کرسکتے ہیں، انسان کے لئے جائے پناہ آج بھی پیغمبرانہ دعوت کے اندر موجود ہے، اگر وہ میزان قائم کرلی جاتی ہے تو پھر امید ہے بلکہ یقین ہے کہ بربادی کے کنارے کھڑا ہوا انسان عذابِ الٰہی کی گرفت سے محفوظ رہے۔

آخر میں ہم صحیح بخاری کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو ہماری سوسائٹی کا آئینہ اور ناخدا ترس قائدین کی غلط رہنمائی کا شاخسانہ ہے:

عن النعمان بن بشير رضي الله عنهما عن النبي ﷺ أنه قال: مثل القائم على حدود الله والواقع فيها كمثل قوم استهموا على سفينة، فأصاب بعضهم أسفلها، فكان الذين في أسفلها إذا استقوا من الماء مرّوا على من فوقهم، فقالوا:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حدوداللہ کی حفاظت اور اس کی مخالفت کرنے کی مثال ایک گروہ کی جیسی ہے جس کے افراد نے ایک کشتی میں اپنی جگہیں قرعہ اندازی سے بنالیں، کچھ لوگ اس کے اونچے والے حصہ میں تھے اور کچھ لوگ اس کے نچلے حصہ میں، نچلے حصہ والے جب پانی لینا چاہتے تو اوپر کے حصہ میں آکر

لو إنا خرقنا في نصيبنا خرقا ولم نوذ سن فوقنا، فإن يتركوهم وما ارادو اهلكوا جميعا،وإن أخذوا علي أيديهم نجوا و نجّوا جميعا (رواہ البخاری)

پانی لیتے، نچلے حصہ والوں نے کہا کہ اگر ہم اپنی جگہ سے نچلے حصہ میں ایک سوراخ کردیں تو اوپر والوں کو بار بار ایذاء پہنچانے سے بچ جائیں گے، اب اوپر والے اگر ان کو ایسا کرنے دیں تو سب ڈوب جائیں گے اور اگر روک دیں تو دونوں بچ جائیں گے۔

اونچے اور نیچے حصے کو کسی اسٹیمر یا بڑے دریائی جہاز کی پہلی اور دوسری منزل نہ سمجھئے، بلکہ بڑی ناؤ میں ایسا ہوتا تھا، ناؤ کے آدھے حصہ کو درمیان سے پاٹ دیا جاتا تھا، پارٹیشن کے نچلے حصے والے ایک طرح سے بند ہوجاتے تھے، سمندر سے پانی لینے کے لئے اوپر آکر ڈول ڈال کر پانی لینا پڑتا تھا، ان کو جب پانی کی ضرورت ہوتی تو اوپر آتے، ان کے بار بار آنے جانے سے اوپر بیٹھے ہوئے مسافروں کو تکلیف ہوتی، اس لئے انہوں نے سوچا کہ بجائے ان کو ایذاء دینے کے ہم خود انتظام کرلیں اور اپنی جگہ پر ایک سوراخ کردیں، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو پانی بھر جاتا ہے اور سب ڈوب جاتے ہیں۔

رسولِ کریم ﷺ نے جو تمثیل دی ہے وہ انسانیت کی ہے، دنیا کشتی ہے، کچھ لوگ راحت و آرام کی جگہ پر ہیں یعنی مال دار اور مرفہ

الحال ہیں، ہوا، دھوپ، روشنی وغیرہ سے بہرہ مند ہیں۔ اور ایک طبقہ غریبوں کا ہے جو دنیاوی نعمتوں سے محروم ہے۔ اگر محروم طبقے کو پانی لینے سے روک دیا جاتا ہے، یعنی ضروریاتِ زندگی نہیں فراہم کی جاتی ہیں تو وہ اپنی بے بسی کا انتقام اس طرح لیں گے کہ اس پوری کشتی کو ڈبا کر اپنی اور سب کی ہلاکت کا سبب بنیں گے، لہٰذا جو لوگ بخت و اتفاق سے سوسائٹی کے سربرآوردہ ہیں وہ اگر پسماندہ طبقہ کی حاجت روائی کو مدِ نظر نہ رکھیں تو یہ پوری کشتی سلامت نہیں رہ سکتی۔

حدود اللہ سے مراد شریعت کے احکام ہیں، حد اس نشان کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حد بندی کردے، تاکہ اس کی بتائی ہوئی حد کے اندر رہیں،"القائم علی حدود اللّٰہ" حدود کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سرحدوں کی حفاظت کی جائے، قرآن پاک میں یہ لفظ اس مفہوم میں آیا ہے:

﴿إِلَّا أَنْ يَّخَافَا أَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۲۲۹] — مگر یہ کہ ان کو خوف ہو کہ وہ اللہ کے قائم کردہ حدود پر قائم نہ ہوسکیں گے۔

اور ایک جگہ آیا ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ [البقرة: ۱۸۷] — یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔

"الواقع فیھا" حدود کے اندر گھس جانا، یعنی احکامِ الٰہی کی

مخالفت کرنا اور جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی پرواہ نہ کرنا۔

حدیث شریف میں لفظ "استھموا" آیا ہے، اس زمانے میں اس طرح کے کام کہ کس کو کون جگہ ملے، قرعہ اندازی سے طے پاتے تھے، "سھام" تیر کو کہتے ہیں، اس تیر سے قرعہ اندازی کرتے تھے۔

شریعت جو احکام کا مجموعہ ہے اس پر پابند رہنا، حدیثِ نبوی کی تعبیر میں حدود قائم کرنا ہے، جیسے نماز کی ادائیگی کو "إقامة الصلاة" کہا گیا ہے، اسی طرح "إقامة الحدود" کا مطلب ایک حد بندی کے اندر رہنا ہے اور حدود میں واقع ہونا حدود کے توڑنے کا مفہوم رکھتا ہے، لہٰذا پوری حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ حدود کا احترام کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں، فرق یہ ہے کہ کچھ لوگ اچھی جگہ پر ہیں اور کچھ لوگ اچھی جگہ پر رہنے والوں کے محتاج ہیں۔ جن لوگوں کو کسی حاجت مند کی حاجت روائی کی صلاحیت ہے وہ حاجت مندوں سے ڈرتے رہیں کہ اگر انہوں نے کشتی والوں کی رعایت نہ کی تو پھر ان کی بلندی بھی قائم نہیں رہے گی، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانیت کی پوری کشتی ڈوب جائے گی۔

اس تمثیل کی عملی تطبیق ہر دور میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بازنطینی حکومت کہا جاتا ہے کہ چھ ہزار برس سے قائم تھی مگر عوام کے حق میں ایک لعنت تھی، جس میں غریب طبقہ غریب تر ہوتا جارہا تھا اور

بروکریٹ طبقہ اپنی ہوس رانی کے لئے پوری قوم کو ایندھن بنائے ہوئے تھا۔ اسی طرح ساسانی حکومت صفحۂ ہستی سے ناپید کردی گئی، کیوں کہ انسان کا ایک طبقہ اپنے موروثی اعزاز کے آگے اپنے ہم جنس انسانوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا، یہی صورتِ حال آج بھی ہے، جب تک کسی قوم کا عروج ہے، سلطنت کی چمک دمک ہے، وسائلِ زندگی کی بہتات ہے، اس وقت کوئی محسوس نہیں کرتا کہ کبھی یہ چراغ بجھ سکے گا، دن کی روشنی رات سے بدل جائے گی اور وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے گا، مگر ایک نبیؑ اپنی نگاہِ بصیرت سے وہ دیکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے ہیں، اور وہ آگاہ کرتا ہے کہ تم عنقریب عذابِ الٰہی کا شکار ہوجاؤ گے، جو لوگ اس کی بات مان لیتے ہیں وہ دنیا و آخرت کی نجات کے مستحق ہوتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا مظہر صرف مسلمان یا عرب نہیں تھے بلکہ آپؐ رحمۃ للعالمین تھے، اللہ کی مخلوق جہاں بھی اور جس شکل و صورت میں بھی پائی گئی وہ آپؐ کے دامنِ رحمت کے سائے سے محروم نہیں تھی، اسلام سے پہلے مال دار عربوں کا یہ بھی طریقہ تھا کہ جب کوئی دعوت کرتے تو جانور کے گوشت کا کوئی خاص حصہ ہر مہمان کو پیش کرنا چاہتے، مگر وہ ناکافی ہوتا تو دوسرے اور تیسرے جانوروں کو بغیر ذبح کئے صرف اس حصۂ جسم کو کاٹتے جہاں کا گوشت

مطلوب ہوتا، مثلاً دنبے کے دم کی چکتی اور اونٹ کے کوہان کی چربی بغیر ذبح کئے کاٹ کر نکال لیتے اور جانور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔ رسول اللہ ﷺ نے سختی سے اس کی ممانعت فرمائی اور اسے حرام قرار دیا، (۱) اور فرمایا کہ ذبح کرنے میں جانور کو چند لمحات کی تکلیف ہوتی ہے اور اس طریقۂ کار میں وہ گھنٹوں تڑپتا رہتا ہے، رحمۃ للعالمین ﷺ کے اخلاق اور لطف وکرم کا برتاؤ ان بے زبان جانوروں کے ساتھ بھی تھا۔

کچھ لوگ ایک چڑیا کے بچے پکڑ لائے، چڑیا اپنے بچوں کی محبت میں ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے؟ اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ (۲)

آنحضرت ﷺ ایک چیونٹی کو بھی ایذاء پہنچانے والے کو اللہ کا خوف دلاتے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپؐ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں یا

(۱) سیرۃ النبی، ج: ٦، باب جانوروں کے حقوق بحوالہ مشکاۃ المصابیح، کتاب الصید والذبائح

(۲) أبو داود، باب في كراهة حرق العدو بالنار.

درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپؐ نے دریافت فرمایا: یہ کس نے کیا ہے؟ ان صاحب نے کہا: یارسول اللہ میں نے کیا ہے، آپؐ نے فرمایا: بجھاؤ، بجھاؤ۔(۱) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں)۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعہ متنبہ کیا کہ صرف ایک چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا؟ (۲) (یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام کا قصور نہ تھا۔)

سیرتِ نبوی کا اہم ترین حصہ رسولِ کریم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ پر مشتمل ہے، اس موضوع پر متقدمین اور متأخرین نے دل کھول کر اور بڑی وسعت کے ساتھ لکھا ہے، امام ترمذیؒ کی "الشمائل المحمدیہ" جو شمائلِ ترمذی کے نام سے مشہور ہے، (یعنی أحادیث في الشمائل، مؤلفہ امام ترمذیؒ) اس کے مختصرات بھی مرتب ہوچکے ہیں جن میں ایک مفہوم کی چند احادیث میں سے ایک حدیث کو لیا گیاہے، اور مختلف

---

(۱) أبو داود، باب في كراهة حرق العدو بالنار.

(۲) صحيح بخاری، كتاب الخلق

مقامات پر ترجمۃ الباب کی رعایت سے صحاح و سنن، مسندات و مؤطات میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو شمائلِ نبوی سے مزین نہ ہو۔

ابھی حال ہی میں - چند سال پہلے- مسجد الحرام کے امام و خطیب ڈاکٹر صالح بن حُمید (موجودہ صدر مجلس شوریٰ) کی سرکردگی میں علماءِ مصر و شام اور سعودی محققین نے بارہ ضخیم جلدوں میں "نضرۃ النعیم" کے عنوان سے اخلاقِ نبویہ کی شرح و تفصیل کی ہے، لیکن عربی اور اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور سب سے زیادہ صحت و اعتدال کا نمونہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ النبی جلد ششم ہے، جس کا عنوان "سیرت النبی مشتمل بر تعلیمات واخلاق" ہے، زبان و بیان کی دل آویزی کے ساتھ ساتھ، محبت و صداقت اور حبِ نبوی کا ایک جوش مارتا ہوا دریا ہے جو علم کی وسعت وگہرائی کی روشن دلیل ہے، ہم تبرکاً صرف ایک مختصر مقالہ یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک معلمِ اخلاق کی حیثیت سے آئینہ کی طرح واضح ہوجاتی ہے۔

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

(از علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہہ کیا، اور اخلاق و آداب کے وہ سبق ان سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں، اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے، اور ان میں درسگاہِ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے بنی نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب کی بنیاد پر رکھی ہے، جیسے انبیاء علیہم السلام، اور بعض مذہبوں کی بانی،

دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انبیاء و مصلحینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکمِ خداوندی" کو قرار دیا، اس حکم وفرمانِ الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیم میں علت ومعلول کا مسئلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے، اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت، مگر۔

یارِ ما ایں دارد وآن نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب وحکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیاءؑ اور حکماء میں جو اصلی فرق وامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاءؑ کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، ان کے مقدس

کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں؛ جن کا فیض ان کے ہر بُنِ مُو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے، اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی، جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ وری سے دنیا محوِ حیرت ہے، اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی قوت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کے ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا، وہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راست باز نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لئے اس کے منھ کی آوز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منھ پر ہے

وہی دل میں ہے اس لئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحبِ اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قومیں کی قومیں ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج و مراتب کو پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت سے کامل ہونے کے بعد ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں، اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لئے حسبِ ذیل معیاروں پر اترنا نہایت ضروری ہے:

۱- اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

۲- اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

۳- اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہب کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامعِ کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کی حالات میں شامل کر دیا ہے، اور قرآن نے ان کو ہر جگہ ان بے ہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں

تمہارے سامنے ہیں؟ اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تینتیس برس کی زندگی میں صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت ہی کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں، کیوں کہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ:

> "یہاں (سیرتِ محمدی) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمدؐ کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے"۔ (۱)

آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے

---

(۱) باسورتھ اسمتھ کی کتاب، سیرتِ محمد، ص:۱۰۸

خلوت میں کرتے دیکھو اس بات کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو : ألا فليبلغ الشاهد الغائب

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے، اِن مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پر تاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں، اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں، اور ان کی فصاحت و شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

> ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے''

کیا اس نے بھی اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

> ''شریروں کا مقابلہ نہ کرو''

کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

"دشمنوں کو بھی پیار کرو"

کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن سے پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

"تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان ومال سے زیادہ پیار کر"

کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

"اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو"

کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ:

"تم سے اگر کوئی تمہارا کرتا مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو"

کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں یہ صفتیں موجود نہیں تھیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ انجیل نے ان کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ :

﴿أَتَـأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَـنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

[البقرة : ۴۴]

اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ :

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَـبُرَ مَـقْـتًا عِـنْدَاللهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ! بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔

[الصف : ۲،۳]

ایک شخص نے آکر حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا گیا : تم نے قرآن نہیں پڑھا "کان خُلُقُه القرآن" (۱) ۔ جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا، اگر غریبوں اور مسکینوں کی اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپؐ نے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنہوں نے آپؐ پر تیر برسائے

(۱) ابوداود باب صلاة الليل

اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپؐ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کردی۔

سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیِ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدیؔ اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصر دین کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلاخوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا، فرمایا:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ [یونس: ۱۶]	(اے منکرو) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپؐ کو خطاب کر کے خود آپؐ سے فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [القلم : ۴] (اے محمد) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اُس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگ دلی اور کج روی کا گلہ کرنا پڑا ہے؟ کیا اُس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے؟ یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [الجمعة:۲] وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو صاف بناتا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص ملاحظہ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعوی نہیں ہے کہ وہ

لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک وصاف و مصفاً بھی بنادیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دل کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئیس برس بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیمِ اخلاقی کا تنوع

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالبِ علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگزر کے سوا اور کوئی سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد

رسول اللہ ﷺ کی درسگاہِ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو ونما پارہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپؐ کی حیثیت ایک انسان ، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپؐ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں، اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپؐ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

مدینۃ النبی کی اس درسگاہِ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجور کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے - اور جس کا نام مسجدِ نبوی تھا - اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے تھے، کہیں ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و سعید بن جبیرؓ جیسے اربابِ رائے وتدبیر ہیں، کہیں

خالدؓ، ابو عبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنّن بنے، کہیں ان زُہّاد و عبّاد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ و سلمانؓ و ابو درداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیحِ اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گزارا کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے، اور سب اخلاق کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔

○

شمائلِ ترمذی، صحیح بخاری، کتاب الشفاء، (قاضی عیاضؒ) اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہم کی سیرۃ النبی کے اقتباسات پر مبنی اور مشتمل یہ صفحات مرتب کئے گئے ہیں، جس کو راقم اپنی کوئی تصنیف نہیں سمجھتا، البتہ اقتباس و ترجمہ اور انتخاب کی سعادت اس کے حصے میں آئی ہے جو اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ اس کتابچہ کو ختم کرنے سے پہلے محسوس ہوا کہ بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر احادیث کی روشنی میں ایک مختصر باب قائم کرنا ضروری ہے، کیوں کہ بدعت وخرافات نے سیرت کے بعض اہم اجزاء کو مسخ کردیا ہے، جیسے رنج و راحت اور خوشی و غم کے موقع پر آپؐ کی سنت اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل مجھ کم سواد کو یکجا نظر نہیں آیا، اس لئے مستند ترین روایات کو سامنے رکھتے ہوئے چند صفحات میں اس موضوع پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ واللہ یعلم السرائر و یتقبل الحسنات.

خوشی اور غم کے لمحات میں اسوۂ نبوی

انسان کی زندگی میں مسرت کے دن بھی آتے ہیں اور غم کی ساعت بھی آتی ہے، انسان کبھی ہنستا ہے تو کبھی روتا بھی ہے، مصیبت سے کوئی بشر خالی نہیں، مسرت کی نعمت سے کوئی محروم نہیں، جو لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہیں وہ مسرت کے موقع پر اکڑنے لگتے ہیں اور تکبر سے اترانے لگتے ہیں، اور ذرا سی مصیبت پڑ جائے تو بلبلا اٹھتے ہیں:

﴿وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ

اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہوجاتا ہے، اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو (ایسا اتراتا ہے کہ) کہنے لگتا ہے کہ

فَخُوْر" إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُو الصّٰلِحٰتِ أُولٰئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَة" وَّأَجْر" كَبِيْر﴾ [الهود : ۹-۱۱]

اب دکھ رخصت ہوا، اب کبھی نہ ہوگا، پس وہ اترانے لگتا ہے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے، مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی نفسیات کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے، احادیثِ نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی اور غم کے حالات میں اسوۂ نبوی کیا ہے؟ اور خوشی اور غم کی کتنی نوعیتیں ہیں؟ شرعی احکام کیا ہیں؟ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا ایسے موقع پر کیا طرزِ عمل رہا ہے، اس موضوع کی وضاحت اس طرح کی جارہی ہے کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ فصلوں میں بیان کیا جائے۔

خوشی اور مسرت کے لمحات میں اسوۂ نبوی

خوشی کے دو مواقع ایسے ہیں جن کے وقت اور مدت کا تعین کتاب و سنت سے ہوتا ہے، عید الفطر اور عید الأضحیٰ، ان دونوں مناسبتوں میں رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ پاک احادیث میں موجود ہے، امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں "کتاب العیدین" کا مستقل عنوان قائم کیا ہے، اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جاہلیت کے رسوم کو باقی

نہیں رکھا جائے، جو کپڑے اچھے اور صاف میسر ہوں وہ پہنے جائیں، زیادہ دیدہ زیب، قیمتی، جھلملا قسم کا لباس پہننا قابلِ مؤاخذہ ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے بازار میں زربفت (استبرق) کا ایک جبہ بکتے ہوئے دیکھا، اس کو خرید لائے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کہ آپ کے پاس عرب قبائل کے وفود آتے رہتے ہیں اور عید کا موقع آتا ہے، اس میں آپ اس کو زیب تن فرمایا کریں، حضور ﷺ نے فرمایا: "إنما هذه لباس من لا خلاق له" یہ اس آدمی کا لباس ہے جس کے لئے (آخرت میں) کوئی حصہ نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر خاموش ہوگئے اور مدت تک ایسے کپڑے کا نام بھی نہیں لیا، پھر ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیباج (دیبا) کا ایک جبہ بھیجا، حضرت عمر اس کو لے کر خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "جب میں نے ایک قیمتی جبہ پیش کیا تھا اس وقت حضورؐ نے فرمایا تھا: "إنما هذه لباس من لا خلاق له" اور پھر مجھے اس طرح کا جبہ عنایت فرمارہے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس کو بیچ دو، یا اس میں سے کوئی ضرورت پوری کرلو۔

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوا کہ عید کے روز ایسے کپڑے جو صاف ستھرے میسر ہوں پہن لئے جائیں، مگر اس میں نمائش اور دکھاوے کا

جذبہ نہ ہو، عید الفطر کے دوسرے آداب میں یہ ہے کہ عیدگاہ (مصلیٰ) جانے سے پہلے کچھ کھا لیا کریں، صحیح بخاری میں کھجور کا ذکر آیا ہے اور یہ کہ ان کے طاق عدد ہوں۔ (تین، پانچ، سات، صرف ایک)

عید الفطر کے دو اہم ترین عنصر یہ ہیں : نمازِ عید جو کہ واجب ہے، اور صدقۂ فطر ادا کرنا جو کہ فرض ہے جس کے بغیر روزے قبول نہیں ہوں گے، تفصیلات، فطرہ کی مقدار اور نمازِ عید کی تکبیرات کا زیادہ ہونا، اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے رہنا، نماز کے بعد خطبہ دیا جانا، یہ سب فقہ کی چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتاب میں موجود ہے۔

اسی طرح عید الأضحیٰ بھی ایک مسرت کا دن ہے اور مسرت کے حدود مقرر ہیں، اور اس کے مسائل اور مسائل کے جزئیات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، یہاں ان کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے، میرے موضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ عید الفطر اور عید الأضحیٰ کی مسرتیں اس میں جو شریعت کا جزء ہیں ان پر گفتگو کی جائے۔

چونکہ مسرت ایک اندرونی جذبہ کا نام ہے، انسان کو اس پر قابو نہیں ہے کہ جب چاہے اپنے اوپر مسرت طاری کرے اور جب چاہے اس سے بے نیاز ہوجائے، اس لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ رمضان ختم ہونے کے بعد اور حج ادا کرنے کے بعد مسرت کا اظہار کرو، یا خوشی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرو، البتہ آدابِ مسرت کا تعین کردیا گیا،

عیدِ رمضان (عید الفطر) اور عیدِ حج (عید الأضحیٰ) میں دو رکعت نمازوں اور خطبہ کا اضافہ کیا گیا، روزانہ کی پانچ وقتوں کی نمازوں کے بجائے چھ وقتوں کی نماز ہوگئی، اور صدقہ اور قربانی کو واجب قرار دیا گیا، اس کے علاوہ کوئی بات فرض نہیں کی گئی کہ اچھے کپڑے پہنو، ایک دوسرے سے گلے ملو، خوشبو کا استعمال کرو، جو بات واجب ہوئی وہ ایک اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہونا، گویا رمضان کے روزے رکھنے اور حج کے اکثر ارکان کے ادائیگی کی توفیق پر شکر ادا کرنا۔

مسرت کا تیسرا موقع جس کی تاریخ انسان خود مقرر کرتا ہے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ہے، اس موقع پر جو بات ضروری ہے وہ حسبِ استطاعت ولیمہ کرنا، غرض مسرت کے تمام مواقع پر غریبوں اور دوستوں کو کھانا کھلانا اور اللہ کی عبادت کرنا، نکاح میں خطبۂ نکاح سننا، سنانا کارآمد بات ہے اور آنحضرت ﷺ کا اسوہ ان مواقع پر یہی ہے، ہاں آپؐ نے غیر مضر اور حیاء وشرم کے حدود کے اندر رہتے ہوئے نغمۂ شادمانی کو مباح رکھا ہے، جیساکہ حبشیوں کا ناچ جسے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا اور وہ واقعہ جس میں انصار کی دو لڑکیاں ام المؤمنین کو کچھ نغمے سنا رہی تھیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ناگواری کا اظہار کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں یہ نغمہ سرائی؟ مگر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان کو گانے دو، اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ مسرت کے

موقعہ پر حدودِ حیاء وشرم کو ملحوظ رکھتے ہوئے مبارکبادی کے نغمے بجانا حرام نہیں ہے:

عن عائشة رضی الله عنها...وكان يوم عيد يلعب السودان بالدرق و الحراب، فإما سألت النبی ﷺ و إما قال: "تشتهين تنظرين؟" فقلت: نعم، فأقامني ورائه، خدی علی خده، وهو يقول: "دونكم يابني أرفدة" حتی إذا مللت قال: "حسبك؟" قلت: نعم، قال: "فاذهبی"(۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا عید کے دن کالے قسم کے لوگ چمڑے کی ڈھال پر نیزے سے مقابلہ کر رہے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں یا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے گذارش کی یا آپؐ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا دیکھنا چاہتی ہو؟ میں نے کہا: ہاں، آپؐ نے اپنی پشت کی طرف مجھے کھڑا کیا اور آپ کے شانے پر منھ رکھے ہوئے میں اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آپؐ کے رخسار سے میرا چہرہ مس کر رہا تھا اور آپؐ فرما رہے تھے: "ذرا خیال کرو اے بنو ارفدہ" (بنو ارفدہ سے مراد یہی کالے لوگ ہیں) یہاں تک کہ میں اکتا گئی، فرمایا: بس دیکھ چکیں؟ میں نے کہا: جی ہاں، فرمایا: پھر جاؤ۔

عن عائشة رضی الله عنها قالت: دخل أبوبكر وعندی

(۱) "الصحيح" للإمام البخاري، كتاب العيدين، باب "سنة العيدين لأهل الإسلام"

جاريتان من جواری الأنصار تغنيان بما تقاولت الأنصار يوم بعاث، قالت: و ليستا بمغنيتين، فقال ابوبكر: أمزامير الشيطان في بيت رسول الله ﷺ؟ و ذلك في يوم عيد، فقال رسول الله ﷺ: "يا أبابكر، إن لكل قوم عيدا، و هذا عيدنا" (۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ (میرے والد ماجد حضرت) ابو بکر ایسے وقت میں تشریف لائے کہ بعض انصار کی لڑکیاں گا رہی تھیں جو کہ انصار یومِ بعاث کے پر ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: وہ گانے والی نہیں تھیں، (یعنی پیشہ ور گلوکارہ نہیں تھیں) حضرت ابو بکر نے فرمایا: شیطانی مزامیر اور رسول اللہ کے گھر میں؟ اور یہ عید کا دن تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر ہر قوم کی ایک عید (خوشی کا دن جو بار بار آئے) ہوتی اور یہ ہماری عید ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر معمولی دف یا معمولی باجے کے ساتھ اسی طرح کے نغمے یا اشعار گائے جائیں تو ممنوع نہیں ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اعتراض یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر پر کسی قسم کے باجے گاجے (مزامیر) لائیں جائیں، مگر حضور ﷺ نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

---

(۱) "الصحيح" للإمام البخاري، كتاب العيدين، باب "الحراب و الدرق يوم العيد"

قالت الربيّع بنت معوذبن عفراء: جاء النبي ﷺ حين بُني عليّ، فجلس على فراشي كمجلسك مني، فجعلت جويريات لنا يضربن بالدفوف و يندبن من آبائي يوم بدر، إذ قالت إحداهن: "و فينا نبي يعلم مافي غد" فقال ﷺ: "دعي هذه و قولي بالذي كنت تقولين" (۱)

حضرت ربیّع بنت معوذ بن عفراء فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر اس وقت تشریف لائے جب میری شادی کے بعد رخصتی ہوچکی تھی اور آپؐ ہمارے بستر پر اس طرح بیٹھے جس طرح تم ہمارے سامنے بیٹھے ہو، ہمارے یہاں کی لڑکیوں نے دف پر تھاپ لگا کر گانا شروع کیا جس میں وہ ان لوگوں کا ذکرِ خیر کر رہی تھیں جو بدر کے موقعہ پر قتل ہوئے تھے، ان لڑکیوں میں سے ایک نے یہ مصرعہ پڑھا "اور ہمارے درمیان وہ نبی ہیں جو جانتے ہیں کل کیا ہونے والا ہے،" آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ نہ کہو اور وہ کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کے حضور ﷺ اپنے آپ کو "عالم الغیب" کہلانا پسند نہیں فرماتے تھے، اور یہ صرف اللہ کی صفت ہے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لڑکیوں، بالیوں کا شادی اور مسرت کے موقع پر گا بجا لینا مباح ہے۔

(۱) "الصحیح" للإمام البخاري، کتاب النکاح، باب "ضرب الدفوف في النکاح والوليمة"

رنج و غم کے موقعہ پر اسوۂ حسنہ

رنج وغم کا پیش آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے، انسان کی زندگی اس سے خالی نہیں ہے، قرآن کریم نے ایک آیت میں اس حقیقت کو اس طرح واضح کردیا ہے کہ اس کے بعد کسی دلیل یا مثال کی ضرورت نہیں رہ جاتی، فرمایا:

﴿وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ [البلد: ۳،۴]

اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔

والد (باپ) کا مطلب حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو سب کے باپ ہیں اور "مَاوَلَدَ" کا مفہوم ہے ان کی اولاد، یعنی آدم اور آدم زاد سب کے سب مشقت، مصیبت اور سختی کو جھیلنے پر مجبور رہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، کوئی قارون جیسا دولت مند ہو یا فرعون جیسا حکمراں، کوئی نہ کوئی کمی اپنی زندگی میں پائے گا، کبھی بیماری میں مبتلا رہے گا، کبھی اپنی سیاست میں ناکامی کا منھ دیکھے گا، کبھی اولاد کی طرف سے اس کو غم ہوگا، غم واندوہ سے آزاد کوئی بشر ہوا ہے اور نہ ہوگا، ان انسانوں میں اللہ کے فرستادہ پیغمبر بھی ہیں، اولیاء و صالحین بھی ہیں، یہاں تک کہ خود رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذاتِ گرامی بھی غم واندوہ سے خالی نہیں رہی، بلکہ آپ ؐ کو انسان کی

نجات کی فکر اور لوگوں کی بے راہ روی کا اس درجہ غم تھا کہ آپؐ کی شمائل کی احادیث کی متعدد روایتوں میں یہ لفظ آتا ہے: "كان متواصل الأحزان" یعنی آپؐ پر غم کی یورش اس درجہ رہتی کہ ایک غم کے بعد دوسرا غم آپؐ پر طاری رہتا۔

یہ تو پیغمبرانہ اولو العزمی تھی کہ آپؐ ساری انسانیت کا غم اپنے سینے پر اٹھائے رہتے تھے،اس کے علاوہ وقتی غم جو بشریت کا تقاضا ہے، جیسے اولاد کی موت کا غم، جب حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

إن العين تدمع، و القلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا، وإنا لفراقك يا إبراهيم لمحزونون (۱)	آنکھ اشک آلود ہوتی ہے، دل غمگین رہتا ہے اور (زبان سے) ہم صرف وہ بات کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو، اور اے ابراہیم تیری جدائی سے ہم غمزدہ ہیں۔

اسی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا غم کوہ بن کر آپؐ پر ٹوٹا، غزوۂ احد میں صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد کا شہید ہونا، جناب عبدالمطلب جو جنابِ رسول اللہ ﷺ کے جدِ امجد تھے ان کی موت کا غم، حضرت ابوطالب جو ہر مصیبت میں آپؐ کے پشت پناہ ہوا

(۱) كتاب الجنائز، باب قول رسول الله ﷺ إنا لفراقك يا إبراهيم لمحزونون

کرتے تھے ان کا بغیر کلمہ ءِ شہادت پڑھے دنیا سے گزر جانا آپؐ کے لئے مستقل ایک صدمے کی بات تھی، حضرت ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا غم جو صرف آپؐ کی رفیقہ ءِ حیات ہی نہیں تھیں بلکہ ایمان لانے میں سب سے آگے تھیں اور آپ (ﷺ) کی ڈھارس بندھانے، ہمت دلانے میں وہ کارنامہ انجام دیا جس سے اسلام کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہوگئی، ان کی وفات آپؐ کی زندگی کا اہم ترین حادثہ تھا، ان تمام مصائب کے باوجود آنحضرت ﷺ کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی، حالانکہ ایک ایک غم ایسا تھا کہ اگر غیر نبیؑ پر پڑتا تو اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

گذشتہ صفحہ میں آپؐ کے سامنے عیدین کے آداب ورسوم کا ذکر آیا ہے، جس کی شرعی اور قانونی حیثیت ہے، مگر غم کی کوئی یادگار منانے اور بار بار اس کا ذکر کرنے کی کوئی سنت آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں نہیں ملتی اور نہ صحابہؓ کرام نے خود آنحضرت ﷺ کے گزر جانے کے بعد کوئی تقریب یا یادگار منائی، غم سے انکار نہیں مگر غم کی یادگار منانا اسلام کے لئے ایک نئی چیز ہے۔

سیرتِ نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو اندرونی ملال ، فکر مندی اور اندر اندر غم کا رہنا، جس کے لئے "متواصل الأحزان" کی تعبیر صحابہؓ کرام نے پسند فرمائی اور یہ اپنی جگہ پر بہت

ہی بلیغ اور معنی خیز جملہ ہے، اس کو آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک آدمی کو اپنی جوان بیٹیوں کی شادی کی فکر دامن گیر رہتی ہے، بسا اوقت اولاد کے نکمے پن کا صدمہ رہتا ہے، وہ یوں تو لوگوں سے ملتا اور ہنستا بولتا ہے، مگر اندر اندر سے گھلتا رہتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے "الشمائل المحمدیہ" میں صحاح سے نقل کرکے آپؐ کے ہنسنے اور رونے کی کیفیت کا بھی ذکر کیا ہے اور مستقل باب قائم کئے ہیں، مگر ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، مسلسل غم کا بوجھ اٹھائے رہنا اور فطرتِ بشری کے تقاضا سے کسی بات پر مسکرا دینا عام زندگی میں ہم دیکھا کرتے ہیں، پھر وہ ذاتِ گرامی جو صبر و حکمت، قوتِ برداشت میں نظامِ فطرت پر قائم تھی، اس کے اندر غمِ مسلسل کے ساتھ ہنسے بولنے کی خاصیت کا پایا جانا کوئی متضاد بات نہیں ہے۔

اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کبھی قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں تھے، آپؐ کا ہنسنا تبسم سے زیادہ نہیں ہوتا تھا، پھر اگر کوئی کہے کہ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ کی ہنسی مسکراہٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، دوسری طرف ہنسنے کا ذکر کرتے ہیں، اس میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، جب کہا گیا کہ آپؐ فلاں بات پر ہنس دیئے، اس کا مطلب یہی ہے کہ آپؐ کی جو ہنسی تھی اس کا ظہور ہوا،

یعنی مسکراہٹ، اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ایک شخص بیماری کی وجہ سے کھانا چند لقموں سے زیادہ نہیں کھاتا، اس کے بارے میں کہا جائے اس نے دن کا کھانا کھا لیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی جو خوراک ہے اس کے مطابق اس نے کھانا کھا لیا، ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اوپر کی سطروں میں مسرت اور غم کا ذکر تھا جو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اور ہر ایک کو پیش آتا ہے، اس میں چند باتیں واضح ہو کر سامنے آگئیں :

۱- آپ ﷺ امت کی خاطر ہمیشہ دل گرفتہ اور مغموم رہا کرتے تھے۔

۲- وقتی مصائب، موت کے حوادث، جہاد میں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان، آپؐ کو صدمہ پہنچایا کرتا تھا جو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔

۳- کبھی آپؐ نے یا آپؐ کے صحابہؓ کرام نے کسی غم کی یادگار نہیں منائی، دسواں چالیسواں، سالانہ، تقریبِ غم کی رسم نہیں ڈالی۔

۴- آپؐ کی ہنسی مسکراہٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

۵- آپؐ صحابہؓ کرام، اہلِ بیت (ازواجِ مطہرات) سے ہنس بول لیا کرتے تھے، ان کو پرانے زمانے کے من گھڑت قصے (خرافہ) بھی سنایا کرتے تھے۔

۶- کبھی کسی سے ہنسی مذاق کی بات بھی کرلیا کرتے تھے، جیسے ایک معمر خاتون سے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، جب وہ رونے لگیں تو آپؐ نے بتایا کہ جنت میں سب جوان رہیں گے، یا ایک لڑکے جن کا نام عمیر تھا، ان کے ہاتھ میں ایک پرندہ رہا کرتا تھا، مرگیا تو آپؐ نے فرمایا: "یا عمنیر، ما فعل النغیر؟" اے عُمیر، نُغیر کیا ہوا؟ غرض امت کا غم اور تسلسلِ غم اس بات سے مانع نہیں ہوتا کہ آپ اپنے جیسے انسانوں کی دل بستگی کے لئے کبھی ہنسنے ہنسانے کی بات بھی کرلیں۔

کسی عزیز کی موت سے جو صدمہ پہنچتا ہے اس پر صبر کرنا چاہئے، صبر کے معنی ہیں دل و دماغ پر کنٹرول رکھنا، حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کلام کے ترجمہ میں صبر کا ترجمہ "محنت سکارنا" کیا ہے، قرآن میں اس لفظ کے دوسرے معنی سے مفہوم اور واضح ہوجاتا ہے:

﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔

[البقرة : ۱۷۵]

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ [النحل: ۱۲۷] اور آپؐ صبر کیجئے اور آپؐ کا صبر خاص خدا کی توفیق سے ہے۔

حدیثِ نبوی میں بہت ہی پُر حکمت، بلیغ اور پورے مفہومِ صبر کو

بتانے والا جملہ فرمایا گیا ہے :

الصبر عند الصدمة الأولى صبر تو وہ ہے جو غم کی پہلی ٹکر پڑنے پر کیا جائے۔ (اور وقت گزرنے پر ہر ایک کو صبر آ ہی جا تا ہے، وقت تو ہر غم کا مرہم ہو تا ہے، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم۔)

حرفِ اختتام

حضورِ انور رسولِ کریم ﷺ کی ظاہری جسمانی ساخت، روئے انور، گیسوئے مبارک، اندازِ گفتگو، معاملات، لوگوں کی ہمدردی اور ان کی مدد کے معمولات کا بار بار پڑھنا، سننا اور سنانا آپؐ کی محبت کو بڑھاتا ہے، یہ بہت سے بزرگوں اور اہلِ علم کا تجربہ ہے۔

راقم سیہ کار کو یہ شرف حاصل ہے کہ امام ترمذیؒ کی شمائل کو اپنی نوجوانی کے زمانے میں پڑھایا ہے اور غریب الفاظ اور پیچیدہ تراکیب پر مشتمل جملے اس کو زبانی یاد تھے اور اب بھی کسی قدر الحمد للہ یاد ہیں۔

ادھر چند ماہ سے یہ گنہ گار بیمار ہے، علالت سے پہلے ایک علمی کام شروع کیا تھا جو پورا نہ ہوسکا، اس کے لئے مراجع و مصادر کی تلاش جاری تھی اور بے کار پڑے رہنے کی عادت نہیں، اتفاق سے سیرت پر ایک کتاب کا مطالعہ جاری تھا جس کو چھوڑ نہ سکا، شمائل کے بعض حصوں کے ترجمے جو اس احقر کے ذہن میں آئے وہ بلاغت

سے قریب نظر آئے، اس لئے ان کو قلمبند کرنے کی خواہش سب پر غالب آگئی۔

اتفاق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان ہے، بعض مصادرِ سیرت موجود نہیں تھے، ان کی ذہنی تلاش تھی، سوچ رہا تھا کہاں سے منگاؤں، ان میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس اللہ سرہ کی سیرت النبی کی تیسری اور چھٹی جلد بھی تھی، تیسری جلد ہمارے قدیم دوست جناب نصار رفیع صاحب نے فراہم کردی اور ایک جلد ہمارے بھتیجے سید حسن عسکری طارق (انجینئر ٹیلفون، مدینہ منورہ) نے اپنے حلقہ احبابِ جدہ سے حاصل کی، میری ایک کم عمر پوتی ہانیہ بنت سعد عبد اللہ ندوی نے قاضی عیاض کی کتاب الشفاء ہدیۃً لاکر دی، ایک دوسرے عزیز نے بغیر کسی طلب کے رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری لاکر ہدیۃً پیش کی، بیماری کی وجہ سے خود لکھنا اور حوالہ جات کے مطابق نصوص نقل کرنا دشوار تھا، اس کا حل حفیدِ عزیز سید ولی حسن ندوی جو میرے حقیقی خالہ زاد بھائی حضرت شاہ محمد ذاکر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور ندوہ کے فاضل ہیں اور مدینہ منورہ کی اسلامیہ یونیورسیٹی سے علم کی تکمیل کر رہے ہیں باوجود اپنی مشغولیتوں کے میرے تعاون پر کمر بستہ ہوگئے۔

مرے فرزند عزیزی ضیاء عبداللہ اور طٰہٰ عبد اللہ اور خویش احمد

ندیم بن محمد شبیر ندویؒ نے خاکسار مؤلف کو سہولتیں پہنچانے اور تیمارداری میں جو سعادتمندانہ کاوش کی ہے اس لائق ہے کہ ان کے لئے دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزاءِ خیر دے اور حبِّ نبوی کے سایہٴ عاطفت میں دین و دنیا کی نعمتیں عطا فرمائے اور اس کتابچہ کو پڑھ کر جن بھائیوں کو دینی و علمی فائدہ پہنچے ان سے بھی اس دعا کی درخواست ہے۔

مصادر وماخذ

۱- قرآن کریم کی آیات کریمہ اور ان کے صحیح حوالہ جات، استاذ محمد فؤاد عبد الباقی کی "المعجم المفهرس للألفاظ القرآن الكريم" سے حاصل کئے گئے۔

۲- آیات کریمہ کے ترجمے مع ان الحاقی عبارتوں کے جو قوسین میں ہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے سے بلاکسی ترمیم کے نقل کئے گئے ہیں۔

۳- صحیح بخاری، مختلف ابواب، جس کے مکمل حوالے دے دئے گئے ہیں۔

۴- الشمائل المحمدية، للإمام الترمذيؒ۔

۵- الرياض النضرة، للشيخ محب الدين جعفر الطبرى الشافعيؒ،(المتوفى سنة ٦٦٤هـ)

۶- الروض الأنف، لأحمد بن الخثعمى السهيليؒ(٤ أجزاء)

۷- السيرة النبوية، لابن هشامؒ

۸- سيرة النبي، للعلامة السيد سليمان الندويؒ

۹- السيرة النبوية، للعلامة أبو الحسن على الندويؒ

۱۰- الاتجاهات الربانية بشرح الشمائل المحمدية، للشيخ محمد عبد الله الجواد الدوميؒ

١١- أخلاق النبي و آدابه، لعبد بن محمد حيان، (المتوفى ٣٦٩ھ)

١٢- الوفاء بأحوال المصطفى ، لابنِ جوزى ، عبد الخالق سليمان النابلسىؒ

١٣- كتاب الشفاء فى حقوق المصطفىٰ للقاضى عياضؒ (المتوفى ٩٣٥ھ)

١٤- مرشد المختار إلى خصائص المختار ، لشمس الدين محمد بن طولون الصالحىؒ (المتوفى ٩٥٣ھ)

١٥- الدر الثمين في خصائص النبي الأمين، لابن الجوزى عبد الرحمان بن علىؒ (المتوفى ٥٩٧ھ)

١٦- مختصر سيرة الرسول، للشيخ محمد بن عبد الوهابؒ

١٧- من خصائص النبى و شمائله، لشعبان محمد إسماعيل

١٨- شرح شمائل الترمذى (فضائل و خصائل [اردو]) للمحدث الكبير الشيخ محمد زكريا الكاندهلوىؒ

١٩- نشر الطيب فى ذكر النبى الحبيب، (اردو) للشيخ اشرف على التهانوىؒ

٢٠- رحمة للعالمين، (اردو) للقاضى محمد سليمان منصور پورىؒ (٣ اجزاء)

٢١- خطبات حيدر آباد،(اردو) للمؤلف :عبد الله عباس الندوى

......☆......

مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

کی شہرۂ آفاق کتاب

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

جو اس وقت دنیا کی چھ زبانوں (عربی، انگریزی، فرنچ، اردو، فارسی، ترکی) میں پڑھی جارہی ہے اور جس کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر سارجنٹ (کیمبرج یونیورسٹی) کو کہنا پڑا کہ "اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش ہوتی کہ اس کتاب کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے اس لئے کہ اس کتاب میں صرف مغربی تہذیب کی مذمت کی گئی ہے"

جس کو پڑھ کر مغربی دنیا کے نامور فاضل لندن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹ سیکشن کے چیرمین ڈاکٹر بکنگھم نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ "اس صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقے پر کی گئی ہے یہ اس کا نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے۔

جس کو پڑھ کر عالم اسلام کے نامور مفکر اور مشہور صاحب قلم سید قطب شہیدؒ نے ان الفاظ میں داد دی کہ "اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ کتاب خاص مقام رکھتی ہے، یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیئے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیئے"۔

جس کو مشرق وسطیٰ کی عظیم تحریک اخوان المسلمین نے اپنے تربیتی کورس میں داخل کیا اور سعودی عرب کی وزارتِ تعلیمات نے اپنے کالجوں کے نصاب میں جگہ دی۔

جو مشرق کے لئے ایک تازیانہ اور مغرب کے لئے ایک چیلنج ہے۔

ناشر: فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر۱ کراچی "۷۴۶۰۰"

فون نمبر ۶۶۰۰۸۹۶

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

- تاریخ دعوت و عزیمت مکمل
- مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
- منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
- دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
- تذکرہ فضل الرحمن گنج مرادآبادیؒ
- تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
- تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
- مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
- نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
- جب ایمان کی بہار آئی
- مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
- حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
- عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
- تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
- مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
- سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
- خواتین اور دین کی خدمت
- کاروان ایمان و عزیمت
- سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ

- نبی رحمتؐ مکمل
- حدیث کا بنیادی کردار
- معرکۂ ایمان و مادیت
- پرانے چراغ مکمل
- ارکان اربعہ
- نقوش اقبال
- کاروانِ مدینہ
- قادیانیت
- تعمیر انسانیت
- حدیث پاکستان
- اصلاحیات
- صحبتے با اہل دل
- کاروانِ زندگی مکمل
- مذہب و تمدن
- دستور حیات
- حیات عبدالحیؒ
- دو متضاد تصویریں
- تحفۂ پاکستان
- پاجا سراغ زندگی
- عالم عربی کا المیہ

ناشر۔ فضل ربی ندوی ۔۔ فون ۔ 6600896

مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد مینشن ۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱، کراچی

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی